سوز و ساز

سوز و ساز

ابوالاثر حفیظ جالندھری

انتسابِ دائمی بہ یادگار شیخ سر عبد القادر مرحوم

نغمہ زار کے بعد

ابوالاثر حفیظ جالندھری

کا

دوسرا مجموعۂ سخن

سوز و ساز

بہ ترمیم و اضافہ ——— تازہ ترین ایڈیشن

از سنہ ۱۹۲۵ء تا سنہ ۱۹۳۵ء

شاعر کے خود نوشت حالات کے ساتھ

مجلس اردو ادب کتاب خانہ حفیظ اردو بازار لاہور

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

قیمت فی نسخہ مجلد — روپے

ملنے کا پتہ:-

سول ایجنٹ: علاء الدین منظہر معرفت انارکلی کتاب گھر۔ چوک مینار۔ لاہور،

یا

اپنے مقامی تاجر سے کہئے کہ آپ کو بغیر خرچہ ڈاک مہیا کرے

یا

مجلسِ اردو اور کتاب خانہ حفیظ اردو بازار سے اصالتاً یا ڈاک سے منگائیے —!

پبلشر

— مہتمم مجلس اردو — ۴۴ چی ماڈل ٹاؤن (لاہور)

فہرست

رومان و عرفان ۸ صفحہ
(علاء الدین کلیم)

بقلم خود از حفیظ بر صفحہ ۲۲۱ دیباچہ پنڈت ہری چند اختر ـــــ ۱۳

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مدینے کے مسافر	۳۵	ہمالیہ	۴۳
ذوقِ زباں گشتی	۳۷	صبح شامِ کوہسار	۴۵
ترانۂ رنگین	۳۹	شہسوارِ کربلا	۴۹
چناب	۴۱	لاہور	۵۳

توبہ نامہ صفحہ ۵۵

کیا پابند نے نالے کو میں نے

جاگ سوزِ عشق	۵۹	پریت کا گیت	۷۵
کوششِ بےثمری	۶۴	سپنا	۸۰
دل ہے پرائے بس میں	۶۶	الفت کا اظہار	۸۲
پرانی بسنت	۷۲	اندھی جوانی	۸۴

حسن اور موت	۸۸	کابل کا گیت	۹۶

چلی ہے جانِ یادِ رفتگاں میں

والدہ کی موت	۱۰۵	ایک اور شام رنگین	۱۲۹
غروبِ آفتابِ سخن	۱۱۱	عصائے پیری	۱۳۱
ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح	۱۱۵	نیندوں کی بستی	۱۳۳
[illegible]	۱۲۰	ایک لڑکی شاداں	۱۳۶
موت کا واقعہ	۱۲۴	ارشاد کی یاد میں	۱۴۰

کوثر چکد از لبم

عیدِ میلاد النبیؐ	۱۴۲	ہماری عید	۱۵۳
ہلالِ عید	۱۴۶	میرا اسلام لے جا	۱۵۵
شہیدوں کی عید	۱۵۱	گلشنِ جنت	۱۶۱

تین نغمے

ٹیگور ۔ اقبال ۔ حفیظ	۱۶۵	جوہرِ ذاتی	۱۷۱

صدائے صحرا

درۂ خیبر	۱۷۵	رقاصہ	۱۸۲
آخری رات	۱۷۹	کنجوس سرمایہ دار	۱۸۷

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم

غزلیات

اگر کوئی بے نقاب کر دے ۱۹۰
سزا دے گئے مجھے ۱۹۳
پشیمانیاں ہیں ۱۹۴
اب تو رہنے دو یہ دنیاداریاں ۱۹۵
گفتگو تو شرافانہ چاہئے ۱۹۶
خدا کا سہارا لئے ہوئے ۱۹۷
ایجاد میری ۱۹۸
بہت مشہور ہوں میں ۱۹۹
ہائے دنیائے فانی ۲۰۰
ایمان بھی نثار کرے ۲۰۱
کوئی اگر دیوانہ ہو جائے ۲۰۲
نہ دبے آسماں سے ہم ۲۰۳
تم سے بھی پوچھا جائے گا ۲۰۴
بہار آئی گلستاں میں ۲۰۵
کیا ہو گیا ہوں میں ۲۰۷
خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں ۲۰۸
ملی ہے زندگی فانی مجھے ۲۰۹
سب کچھ حسین ہے ۲۱۰
ہم بھی چپ رہے ۲۱۱
دیکھ رہا ہوں خدا کو میں ۲۱۲
نہ مرنا نہ جینا ۲۱۳
لیکن آج کیا کروں ۲۱۴
اگر خدا نہ ملا ۲۱۵
اپنے ہنر کو کیا کروں ۲۱۶
زمین و آسماں والے نے مارا ۲۱۷
یہ مال پرانا ہے ۲۱۸
پروانہ پروانوں کا ۲۱۹
پستیاں ۲۲۰

رُومان و عِرفان

نغمہ زار کے تازہ ترین ایڈیشن کے آٹھویں صفحہ پر "شعرگوئی اور شعر فہمی" کے زیرِ عنوان سلطان ہی "بقلم خود" کی ڈیڑھ سطر میں شاعر نے جس ضدی شخص کو نئی وضع کے مجموعہائے سخن کی طباعت کا ذمہ دار گردانا ہے۔ وہ خوش نصیب بھتیجا میں ہوں۔ مگر گیا بہہ جانے اور اپنے اصرار پر قائم رہ جانے پر مجھے ہمیشہ ناز رہے گا کہ آخر میں نے اپنی من مانی کر ڈالی۔ حفیظ چچا آج کا کلام کل پر چھوڑتے رہنے کو فکرِ سخن کے لئے ترقی کا معیار بتاتے ہیں۔ اور اُن کی اس عادتِ دائمہ نے ان نئی طباعتوں کو التوا در التوا ہی میں رکھا ہے۔ تاہم وہ بھی یاد رکھیں گے کہ دنیا میں ان کو شکست دینے والا بھی اُن ہی کے خاندان کا ایک فرد ہے۔ اگر میں اُن ہی کے اسلوبِ بیان کی نقل کروں تو یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ میں نے حفیظ صاحب کو چھاپنے پر مجبور کر دیا۔ اُن کی بہت سی ایسی نظمیں، غزلیں، غزلوں کے بہت سے اشعار تھے جنکو خود بخود یا کسی دوسرے کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے نغمہ زار میں شامل نہ کیا گیا تھا۔ اُن میں سے جو کچھ میرے ہاتھ لگا میں نے نغمہ زار کے تازہ ایڈیشن میں بڑھا دیا۔ دورِ "سوز و ساز" میں بھی آپ نے اپنا بہت کچھ اپنے معیار کے قابل نہ گردانا تھا۔ میں نے اُن میں سے بھی کچھ نہ کچھ آج شامل کر دیا ہے۔ جسے اشاعت کے متن میں آپ دیکھیں گے۔ یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے کہ میرے چچا صاحب اپنی طبع زاد اولاد کی معمولی سی خامیوں کے بارے کتنے سخت واقع ہوئے ہیں۔ اُن کا ارشاد ہے کہ اولاد صلبی ہو یا معنوی، بری نہیں تو اسے دنیا کے سامنے پیش نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن میرے نزدیک سوال تکنیک کی خامیوں وغیرہ کا نہیں ہے۔ جس دور میں یہ الفاظ کاغذ پر آئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اُس معاشرے نے شاعر پر کیسے تاثرات وارد کئے تھے۔ صرف اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے سوز و ساز کے متن سے باہر بھی رومان و عرفان تکیہ اور دو غزلیں اپنی ذاتی ذمہ داری پر درج کر دی ہیں۔ وہ خطا ہوں۔ تو ہو لیں۔ اہلِ نظر ناقد میری اس جسارت کو خدمت تصور کرے گا۔

علاءالدین مظہر

رُومان

۱

صحنِ چمن کی اک سحر
آج بھی مجھ کو یاد ہے
دل پہ تو داغ ہے مگر
داغ سے دل بھی شاد ہے

چہرۂ شرق لال لال
جیسے کِھلا ہوا گلال
اور صبا کی نرم چال
رقص میں شاخِ ہر نہال
آج بھی ہے وہی خیال

آج بھی ہے مری نظر
نغمہ و رنگ سر بسر
صحنِ چمن کی اک سحر
آج بھی مجھ کو یاد ہے
دل پہ تو داغ ہے مگر
داغ سے دل بھی شاد ہے

۲

حدِّ نگاہ تک تمام
جُزو سے کُل مِلا ہوا
سُرخ سفید نیل فام
تختۂ گل کھِلا ہوا

بلبل و گل کی داستان
حُسن کی عشوہ کاریاں
عشق کی آہ و زاریاں
نہرِ چمن رواں دواں
سرو و سمن یہاں وہاں

برگ و ثمر کا انتظام
فطرت پختہ کار و خام
حدِّ نگاہ تک تمام
جُزو سے کُل مِلا ہوا
سرخ سفید نیل فام
تختۂ گل کھِلا ہوا

۳

ہاں وہ عجیب تھا سماں
درد فزا و پُر سُرور
آئی نظر جو ناگہاں
تختۂ گل پہ ایک حور

آہ وہ پیکرِ شباب
آہ وہ رُوئے بے نقاب
ہائے شرارتی حجاب
ولئے اشارتی عتاب
میرا ہی وہم تھا کہ خواب

پر تو کہوں گا میں کہ ہاں
کچھ تو ضرور تھا وہاں
ہاں وہ عجیب تھا سماں
درد فزا و پُر سُرور
آئی نظر جو ناگہاں
تختۂ گل پہ ایک حور

۴

جامِ بدستِ کائنات
لالہ فروش ہر طرف
حسن پرست شش جہات
دوش بدوش صف بہ صف

موجِ شمیم عطر بیز
فوجِ نسیم تیز تیز
ولولۂ انبساط خیز
ہر زدِ گل نشاط ریز
ایک عروس کا جہیز

اور دلہن وہ ایک ذات
جس کے جلو میں یہ برات
جامِ بدستِ کائنات
لالہ فروش ہر طرف
حُسن پرست شش جہات
دوش بدوش صف بہ صف

۵

آنکھوں میں بجلیاں مگر
اُن کے اثر سے بے خبر
جُنبشِ بر سے بے خبر
زجرِ نظر سے بے خبر
مکر نہیں ، ریا نہیں
ظلم نہیں ، جفا نہیں
نازشِ نارَوا نہیں
سازشِ فتنہ زا نہیں
یہ بھی خبر ذرا نہیں
کس پہ پڑی ہے یہ نظر
برق گری کدھر کدھر
آنکھوں میں بجلیاں مگر
اُن کے اثر سے بے خبر
جنبشِ بر سے بے خبر
زجرِ نظر سے بے خبر

۶

جب وہ خرامِ ناز سے
ایک رَوِش پہ مڑ گئی
دامنِ گُل بھرے ہوئے
سبز پری تھی اُڑ گئی
لے گئی دولتِ قرار
کر گئی ہوش کو شکار
چھوڑ گئی بہ حالِ زار
آنکھ کو محوِ انتظار
دل کو نظر سے شرمسار
شوخیٔ بے نیاز سے
عشوۂ پاک باز سے
جب وہ خرامِ ناز سے
ایک رَوِش پہ مڑ گئی
دامنِ گُل بھرے ہوئے
سبز پری تھی اُڑ گئی

عرفان

۱

تاریکیٔ شب کافور ہوئی
مشرق کی جبیں پُر نور ہوئی

خورشید نوید تاباں کا
اُمّید کے غرفے سے جھانکا

بیداریٔ قسمت کے پرچم
لہرانے لگے میناروں پر
پھر ہونے لگی بارانِ کرم
اِن سوکھے ہوئے گلزاروں پر

کی دستِ صبا نے زبردستی
جاگ اُٹھی سوئی ہوئی مستی

بسنے لگی ہر اُجڑی بستی
ذلّت سے اُبھری ہر پستی

۲

دل غفلت سے بیزار ہوئے
انگڑائیاں لیں بیدار ہوئے
انسانوں کے لشکر جاگے
طوفان اُٹھے محشر جاگے
ارمانوں کی لہریں جاگ گئیں
شریانوں میں نہریں جاگ گئیں
سرگرمی اور ہل چل جاگی
بیکل ہو کر ہر کل جاگی
وقت آیا کارگذاری کا
اک شور اُٹھا بیداری کا
آزادی کی سرشاری کا
سرداری کا مختاری کا
تاریکیٔ شب کافور ہوئی
مشرق کی جبیں پُر نور ہوئی

۳

ہر ملت کے ارماں جاگے
ہر علت کے درماں جاگے
طاقت کے شکاری اُٹھ بیٹھے
ہر سرمایہ داری اُٹھ بیٹھے
تدبیروں کے ہل جوتے ہیں
قوموں نے شور زمینوں میں
افسوس ہم اب تک سوتے ہیں
احساس نہیں اِن سینوں میں
اِس جسم میں جاں بیتاب نہیں
دریا ہے ۔ موجِ آب نہیں
دل درد سے لذت یاب نہیں
افسوس یہ موت ہے خواب نہیں
یہ قافلہ آرام طلب
سوتا ہے راہ میں ہائے غضب

۴

یہ گھاٹی سخت ہے راہ کٹھن
ہر سمت کمیں میں ہیں رہزن
اے کاش یہ نیندوں کے ماتے
آوازِ جرس کو سن پاتے
اے کاش جگا دے کوئی انہیں
ٹھوکر ہی لگا دے کوئی انہیں
اے سونے والو جاگ اُٹھو
دنیا سے نرالو جاگ اُٹھو
اب ہوش سنبھالو جاگ اُٹھو
یوں وقت نہ ٹالو جاگ اُٹھو
ہر ملت کے ارماں جاگے
ہر علت کے درماں جاگے

غزل

دل کو ویرانہ کہو گے، مجھے معلوم نہ تھا
پھر بھی دل ہی میں رہو گے مجھے معلوم نہ تھا

ساتھ دنیا کا میں چھوڑوں گا تمہاری خاطر
اور تم ساتھ نہ ہو گے، مجھے معلوم نہ تھا

چُپ جو ہوں۔ کوئی بُری بات ہے میرے دل میں
تم بھی یہ بات کہو گے، مجھے معلوم نہ تھا

لوگ روتے ہیں میری بدنظری کا رونا
تم بھی اِس رَو میں بہو گے، مجھے معلوم نہ تھا

تم تو بے صبر تھے آغازِ محبت میں حفیظؔ
اس قدر جبر سہو گے، مجھے معلوم نہ تھا

غزل

قولاً - تو ہم بھی قے کے لئے ہاں نہ کر سکے
فعلاً - خلافِ مرضیِ رنداں نہ کر سکے

رکھتے تھے اشکِ گرم بھی ہم آہِ سرد بھی
اظہارِ دردِ دل کسی عنواں نہ کر سکے

بُت خانہ سامنے ہو تو لے کر خدا کا نام
ہے کوئی کام - جس کو مسلماں نہ کر سکے

کچھ اس طرح خلافِ توقع تم آ گئے
ہم گڑبڑا گئے - کوئی ساماں نہ کر سکے

ہستی کا پیرہن نہیں - دامانِ یار ہے
دستِ جنوں بھی جس کو گریباں نہ کر سکے

دل خانۂ خدا ہے شکستِ بتاں کے بعد
ویرانہ ہے جسے کوئی ویراں نہ کر سکے

احباب نے حفیظ تواضع تو کی بہت
لیکن ہماری شان کے شایاں نہ کر سکے

تکیہ

امارت اور شوکت اور سرمائے کی تصویریں — یہ ایوانات سب ہیں حال ہی کی تازہ تعمیریں

اُدھر کچھ فاصلے پر چند گھر تھے کاشتکاروں کے — جہاں اب کارخانے بن گئے سرمایہ داروں کے

مویشی ہو گئے نیلام کیوں یہ کوئی کیا جانے — کچہری جانے۔ ساہوکار جانے یا خدا جانے

زمینداروں کو جا کر دیکھ لے جو بھی کوئی چاہے — "نئے کھیتوں میں اینٹیں تھاپتے پھرتے ہیں تو اچھا ہے"

یہاں اپنے پُرانے گاؤں کا اب کیا رہا باقی — یہی تکیہ ہی اک میں ہی اک جھونپڑا باقی

عظیم الشان بستی ہے یہ نو آباد و ویرانہ

یہاں ہم اجنبی دونوں ہیں مَیں اور میرا کاشانہ

دیباچہ

(از پنڈت ہری چند اختر ایم۔ اے)

شاہنامۂ اسلام اور نغمہ زار وغیرہ کا مصنف اب کسی ماہرِ فن اور بلند آواز نقیب کی خدمات سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ مہذب محفل میں نو وارد اور اجنبی کو بے شک تعارف کی ضرورت ہوتی ہے اس فائدہ کی رَو سے جب حفیظ نو وارد اور اجنبی تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف اہلِ بزم سے خود بخود کر لیا تھا۔ پھر ۱۹۲۵ء میں اُن کے کلام کا سب سے پہلا مجموعہ "نغمہ زار" کے نام سے شائع ہوا تو ملک الشعرا حضرت مولانا گرامی قدس سرہٗ نے چند تعریفی یا تعارفی اشعار کہہ کر اور پروفیسر سید احمد شاہ صاحب بخاری (پطرس) نے چند سطور نثر لکھ کر یہ ضابطہ پورا کر دیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں نغمہ زار دوسری مرتبہ شائع ہوا۔ تو میرے دوست پروفیسر تاثیر ایم۔ اے[1] نے ایک مختصر مگر جامع دیباچہ اس خیال سے بڑھا دیا کہ یہ طرزِ سخن بالکل نیا ہونے کے باعث اردو شاعری کی محفل میں نو وارد کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس نرالے طرزِ سخن کی خصوصیات و امتیازات پر (مختصر طور پر ہی سہی) روشنی ڈالنا تعارف کی شرائط میں داخل تھا۔

پس جہاں تک بزمِ شعر و سخن میں تعارف و تقریب کا تعلق ہے یہ کام ضابطہ کی حد تک انجام پا چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس جامع تعریف کے ساتھ پطرس نے حضرت حفیظ کو بزمِ شعر و سخن میں پیش کیا تھا وہ اس تعریف کے اہل ثابت ہوئے ہیں یا نہیں۔ اور اُن کے طرزِ شاعری کے متعلق جن خصوصیات اور امتیازات کا تاثیر نے دعویٰ کیا تھا انہیں اہلِ بزم نے تسلیم کر لیا ہے یا نامطبوع اور نامعقول کہہ کر رد کر دیا ہے۔

---

[1] ڈاکٹر تاثیر کا ۱۹۵۰ء میں انتقال ہو چکا ہے۔ اب تک اس عہد میں ادب و ادب کے سب سے پہلے نقاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ (ناشر)

کسی شاعر کے کلام اور طرزِ سخن پر ہم دو پہلوؤں سے نظر ڈال سکتے ہیں۔ یعنی موجودہ قبولیت اور قبولِ دوام کی توقع۔ "حضرت حفیظ کی موجودہ قبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی شاعری اور طرزِ سخن کو قبولِ عام کا مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔ بلکہ بقول حضرت تاثیر قبولیت کی سنِ تمیز میں بھی داخل ہو گئی ہے۔ ۱۹۲۲ء یعنی جب سے حضرت حفیظ نے مناظرِ قدرت کی تصویر کشی چھوٹی چھوٹی مترنم بحروں میں جذبات کے اظہار اور دردِ دل کو ملکی دھنوں اور گیتوں کے سانچے میں ڈھالنے کا آغاز کیا ہے۔ اردو کا کوئی رسالہ اٹھا کر دیکھئے شعر و سخن کی کسی محفل میں شریک ہو کر اندازہ کیجئے آپ کو بیک وقت حفیظ کے تتبع کے متعدد نمونے نظر آئیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ تتبع کرنے والوں میں سے اکثر و بیشتر فطری مناسبت سے محروم ہونے کے باعث بہت بری طرح ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو مضحکہ کا سامان بنا لیتے ہیں لیکن سوال کامیاب یا ناکام نقل کا نہیں۔ بلکہ رجحان و قبولیت کا ہے۔ بے بضاعت اور کم سواد لوگوں کی لغزشوں کو آپ قبولیت کی لغزشیں کہہ سکتے ہیں لیکن اگر تتبع واقعی قبولیت کا سب سے نمایاں اعتراف ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ "رنگِ نو" جس کی تخلیق کا باعث حفیظ ہے۔ اردو دنیا کو بڑی حد تک متاثر کر چکا ہے۔ ایک طرف سخن فہم اور ذوقِ صحیح رکھنے والا طبقہ حفیظ کو مخترع تسلیم کر رہا ہے دوسری جانب سخن سنج معاصرین کو یہ سیلابِ رنگ بہائے لئے جا رہا ہے۔ مبتدیوں کا ذکر نہیں کہنہ مشق اور پرانے "سکول" کے مستند شعرائے اردو بھی اس "طرزِ نو" کا تتبع کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ طرز نہ صرف مقبول ہو رہا ہے بلکہ قدامت پرستی کے وہ دعوے دار بھی جو ابتدا میں بعض گفتنی یا ناگفتنی وجوہ کی بنا پر حضرت حفیظ کی جدت کو بدعت قرار دے کر ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے۔ اب اپنے کو حفیظ کے تتبع پر مجبور پاتے ہیں۔

قبولِ دوام کے متعلق میں تسلیم کرتا ہوں کہ فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام لینا سخت خطرناک ہے۔ قبولیت ایک عجیب و غریب مخلوق ہے کہ مر مر کر زندہ ہوتی ہے۔ اور جی جی کر مرتی ہے ایک وقت تک جسے کوئی پوچھتا بھی نہ ہو کچھ مدت کے بعد وہی چمکنے لگتا ہے اور کل جس کے جھنڈے گڑے تھے آج اس کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ اندھا شاعر ہومر جب دنیا میں موجود تھا تو اس کے اشعار سن کر کوئی بھیک بھی مشکل سے دیتا تھا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ یونان کے دس سات شہر جن کے گلی کوچوں میں

وہ دربدر خاک بسر لاٹھی ٹیکتا پھرتا تھا اس کی جائے ولادت ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔ ایرانی شہزادیں سے ایک طرف عمر خیام ہے جس کی قسمت دیکھئے کتنی مدت کے بعد جاگی اور کہاں جا کر جاگی۔ دوسری جانب حافظ شیراز ہیں کہ ان کی قبولیت ان کی زندگی سے اس وقت تک بدستور قائم ہے اور نہ جانے کب تک قائم رہے گی۔ اردو شاعروں میں غالب اور ذوق کو لیجئے۔ اپنی زندگی میں ذوق ملک الشعرا خاقانی ہند تھا اور غالب مہمل گو لیکن آج ملک سخن میں غالب کا سکہ رواں ہے۔ اور ذوق کی شہرت آزاد مرحوم کا وہ سحر کار قلم بھی قائم نہ رکھ سکا جس نے اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو آفتاب ثابت کرنے کی کوشش میں اردو شاعری کو کم از کم پچاس سال پیچھے پھینک دیا۔

ان حالات کے پیش نظر بظاہر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قبولیت کے پیدا ہونے کا وقت متعین کرنا اور اس کے بڑھنے پھیلنے گھٹنے مٹنے سے اس کی عمر کا اندازہ لگانا سخت مشکل ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ زمانہ کس کو کس وقت زندہ درگور کر دیں گے اور کس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر سر پر رکھ لیں گے۔ آنکھوں سے لگائیں گے؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ظاہری موانع کے باوجود قبول دوام کے متعلق تھوڑا بہت اندازہ کر لینا ناممکن نہیں۔ مندرجہ بالا بیان سے قبولیت کے اندازہ کی دشواریوں کے علاوہ کچھ اور بھی معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جن شعرا کو معاصروں کی بدمذاقی اور مذہبی مجلسی یا مقامی تعصبات کے باعث یا بعض دیگر حالات کی بنا پر اپنی موت کے بعد قبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے کلام میں کچھ ایسی باتیں ضرور موجود تھیں جن کا کسی نہ کسی زمانہ میں مرغوب خلائق ہونا لازمی امر تھا۔ حافظ کے کلام میں اکثر باتیں وقت کی ضرورت اور حالات کے مطابق تھیں مگر طرز سخن اور موضوع کلام اس قدر نمایاں مقامی رنگ کے باوجود زمان و مکان کی زنجیروں میں ایسی بری طرح جکڑے ہوئے نہیں تھے کہ آئندہ زمانے اور دیگر ممالک کے باذوق لوگ حافظ کے کلام سے فیضیاب اور مستفید نہ ہو سکیں۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی میں بھی مقبول ہوا اور اب تک مقبول چلا آتا ہے۔ خیام کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ نہ صرف اس کے معاصروں کی بدمذاقی اور تنگ نظری پر دال ہے بلکہ اس افسوسناک حقیقت کا بھی کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ایشیائی نقاد کو یورپی عینک کے بغیر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

غالب کی مثال سے جہاں وقتی رائے کی بے وقعتی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ راز بھی کھلتا ہے

بعض قابلِ قدر جدتیں قبل از وقت معرضِ وجود میں آکر کچھ مدت کے لئے نامطبوع بلکہ مردود ہو جاتی ہیں۔ مگر وقت آنے پر ان کی ایسی قدر ہوتی ہے کہ ملک کے لٹریچر میں دائمی جگہ حاصل ہو جاتی ہے۔ پس اگر عام شعری محاسن کے علاوہ کسی شاعر کے کلام کی نمایاں خصوصیات اور دلچسپی کی وسعت کو پیش نظر رکھ کر قبول دوام کا اندازہ کیا جائے تو اغلب یہی ہے کہ وہ اندازہ بہت بڑی حد تک درست ہوگا۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر اس کسوٹی سے کام لیا جائے تو ان مبصرین کی رائے کو درست تسلیم کر لینے میں ذرا بھی تامّل نہیں ہوتا جن کے نزدیک اردو ادب میں **حفیظ** کی شاعری کا مقام جاودانی ہے۔

حضرت **حفیظ** کے کلام اور طرزِ سخن کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ کرنے سے پہلے چند امور ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ عام طور پر کسی شاعر کے نتائجِ طبع کو اس نظر سے دیکھا جاتا ہے جیسے وہ متقدمین کی تصانیف اور موجودہ ماحول سے الگ تھلگ یکایک ایک خلا میں پیدا ہو گئے ہوں۔ ان پر غور کرتے وقت اس امر کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ جس وقت اس خاص مصنف نے قلم سنبھالا اس وقت ملک کا لٹریچر کس مرحلہ تک پہنچ چکا تھا۔ اور مصنف کے معاصرین کا عام رجحان کیا تھا۔ لیکن یہ طریقہ درست نہیں۔ کیونکہ اس طرح مصنف کے کارناموں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بڑے بڑے مصنفوں پر ہر گاہ اد عمارت نو ساخت کا مقولہ کتنا ہی صادق آتا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیائے ادب کی ہر ایک بستی میں ان زلزلوں کی بنیادیں قدما کے کارناموں کی صورت میں پہلے ہی موجود ہوتی ہیں اور ہر نئے مصنف کو اپنی عمارت ان بنیادوں پر کھڑی کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے کسی نئے معمار کی چابکدستی کا اندازہ صرف عمارت کی ساخت یا شکل و صورت سے نہیں ہو سکتا بلکہ ساتھ ہی یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس نے یہ عمارت کن بنیادوں پر کھڑی کی اور ان بنیادوں پر اس قسم کی عمارت اٹھانے میں کس قدر ہنرمندی کی ضرورت تھی۔

اسی طرح ہر مصنف اپنے ماحول سے بھی لازمی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ کسی قوم کی تاریخ کو اگر اس کے سوانح قرار دیا جائے تو ظاہر ہے خود نوشت سوانح حیات کہنا بالکل بجا ہوگا۔ اس لئے کسی زمانہ کے مصنفوں کی تصانیف ایک طرف تو قوم کے خود نوشت سوانح حیات کا ایک باب ہوتی ہیں۔ اور دوسری جانب ہر باب خود اس زمانہ کی روداد پر مشتمل ہوتا ہے۔ کسی دور کے ادبی کارناموں سے ہم اس زمانہ کے متعلق بہت سی

سی باتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں چنانچہ مختلف محققین نے اپنی تحقیقات کے سلسلہ میں لٹریچر سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئی مصنف ماحول کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا اُسے قوم کے خود نوشت سوانح عمری کے اس باب کی تکمیل میں حصہ لینا پڑتا ہے جو خود اس کے زمانہ کی داستان کا حال ہوتا ہے۔ پھر وہ ماحول سے بے نیاز کیونکر ہو سکتا ہے؟ لہٰذا کسی مصنف کی تصانیف کو خلا کی پیداوار سمجھنے کے بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے اپنے زمانہ کی داستان لکھنے میں کس قدر حصہ لیا، یہ حصہ کس خوبی سے لکھا گیا اور اس حصے کو خدمت اس باب میں جس کا تعلق اس زمانہ سے ہے بلکہ ساری داستان میں کس قدر اہمیت حاصل ہے۔

لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شاعر اپنی زبان اور ادب کی خدمت دو طریقوں سے کر سکتا ہے یا تو پرانی روش پر چل کر ملکی ادب کی تکمیل و تزئین میں حصہ لے۔ اور یا پھر اپنے لئے نئی راہیں نکال کر ملک و قوم کے ادبی سرمایہ میں بیش بہا اور قابل قدر اضافہ کا باعث بنے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر زمانے میں کسی قوم کا ادب بعض خاص رائج الوقت رجحانات کے ماتحت پرورش پاتا ہے۔ لیکن جہاں ایک مبتدع شاعر پرانی روش کو چھوڑ کر نئی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ وہاں وہ اپنے عہد کی رسمی زنجیروں کو توڑ ڈالنے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔ اور وہ اپنے زور طبیعت سے معاصرین کا مذاق بدل کر لٹریچر میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ہر زمانہ کے مذاق کے تابع رہ کر عام روش پر چلنے پر قانع نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بازار کی مانگ کی نسبت زمانے کی ضرورت کا زیادہ خیال رکھتا ہے۔ اور اسی ضرورت شناسی پر اس کے تفوق کا انحصار ہے۔

حفیظ کے جوہر سخن کو کسی خاص ندرت یا ایک آدھ جدت کی بنا پر اچھوتا نہیں کہا جاتا بلکہ اردو شاعری کی عام روش یا فن کو مدنظر رکھیں تو حفیظ کی شاعری ہر لحاظ سے نرالی ہے۔ موضوع کلام مضمون، خیالات، بحور و قوافی کے استعمال اور موضوع کلام سے ان کی مناسبت انداز منظر کشی اور مناظر کا تجزیہ تشبیہات و تلمیحات غرض کسی پہلو سے دیکھئے حفیظ کا کلام انقلاب انگیز جدتوں کا حامل نظر آئے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس چیز کو ہم اب تک "ہماری شاعری" کہتے رہے ہیں وہ اکثر و بیشتر اس کے سوا کسی اعتبار سے ہماری نہیں کہ اس کے مصنف ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ اس شاعری میں خیالات

بندشت. محاورات و طرزِ تکلم "پشت منظر" (بیک گراونڈ) اور اصل تصویر سب کچھ ایران کا ہے اور ہندوستان کا کچھ بھی نہیں۔ حتیٰ کہ اس شاعری کی بنا پر تہذیب و تمدن اور طرزِ معاشرت کا مقابلہ کرکے اگر کوئی مستند ق ہندوستان کو مملکت ایران کا ایک صوبہ یا ضلع کہہ دے تو میرے خیال میں ہم یا اس کو مطعون کرنے کا کوئی حق نہ ہوگا۔

نغمۂ زار کے دیباچہ میں لطیف لکھتے ہیں "ہمارے شاعر رسول سے ترکِ شیرازی پرست ہیں"۔ یہ فقرہ بڑا بلیغ اور پُر معنی ہے۔ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو اس قسم کے مصنوعی اور صرف شاعر کی اپنی ذات کو فریب میں مبتلا رکھنے والی شاعری کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے اور جس کی بنا پر ہماری اردو شاعری نے عام طور پر ایک غیر فطری شکل اختیار کرلی ہے۔ لیکن اگر اس فقرے کے صرف الفاظ ہی کو لیا جائے تو یہ صورتِ حالات بھی کچھ کم باعثِ ندامت نہیں۔ مانا کہ ہندوستان میں رستم و اسفندیار الیسا کوئی شہزور پیدا نہیں ہوا۔ اور ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی ہندوستانی کو گرز اور کمان سے کام لینے کی طاقت اور اہلیت عطا نہیں ہوئی۔ مانا کہ تیغِ ہندی کی تعریف بھی ایرانی شاعروں نے محض مروّت کی راہ سے یا شاید برسبیلِ استہزا کردی تھی اور اس لئے ہمیں اپنی رزمیہ شاعری میں اس کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بھی تسلیم کہ یہاں تہذیب و تمدن کی روایات سرے سے موجود نہیں لیکن کیا اس وسیع براعظم میں جہاں دنیا کی انسانی آبادی کا پانچواں حصہ بستا ہے کسی کمبخت کو عاشق ہوجانے کی بھی توفیق نہیں ہوئی؟ اور اگر ہوئی تو اس کا محبوب ایسا ہی گیا گزرا تھا کہ ہمارے شاعروں کو اس کا ذکر تک گوارا نہیں؟

یہ تو خیر اپنی اپنی پسند کی بات سہی۔ لیکن ہمارے اکثر شعرا کو ہندوستان کی قدیم یا موجودہ زندگی میں بھی کوئی ایسی خصوصیت نظر نہیں آتی جو کلیتہً ہندوستانی ہو۔ اور تو اور یہاں کے موسم اور قدرتی مناظر بھی کسی اعتبار سے قابلِ امتیاز نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً بسنت ہندوستان میں بہار کا پیش خیمہ ہے اور ہمارے موسمِ بہار کی چند خصوصیات بھی ہیں۔ لیکن ہمارے شاعروں کے موسمِ بہار میں وہی بہن ووے کا چمنستان سے عمل لگتا ہے۔ اور "تیغ اردی ماہ" خزاں کا "استاصل" کرتی ہے۔ قدرت کی قلمکاریوں کا مقابلہ صرف مانی اور بہزاد کے کارناموں سے ہو سکتا ہے۔ سرسوں نہیں پھولتی بلکہ زمین پر عکسِ گلبن پڑتا ہے۔ نرگسِ شہلا کے سوا کچھ نظر

نہیں آتا۔ پھر ان ایرانی باغوں اور مرغزاروں میں بلبل کے سوا کس کا زمزمہ فردوسِ گوش بن سکتا ہے ؟

علیٰ ہذا اس موسم کا استقبال بسنت یا ہولی منا کر نہیں بلکہ ایسے انداز میں کیا جاتا ہے جس سے کنارِ رکناباد کی بزم مے نوشی اور گلگشتِ مصلیٰ کا حظ حاصل ہو۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ سب کچھ تو ایران میں ہوتا ہے اور بہار ہندوستان میں آجاتی ہے !! اب اس بہار کے ذکر سے کسی ہندوستانی کے دل میں کن واقعات اور کن مناظر کی یاد تازہ ہو سکتی ہے ؟ اور جب ان بے چاروں کو اس شاعری میں کوئی چیز مانوس ہی معلوم نہ ہو تو وہ اس سے کیا لطف حاصل کر سکتے ہیں ؟

بخلاف اس کے حفیظ کے ہاں بسنت میں سرسوں پھولتی ہے۔ باغوں اور کھیتوں میں ہندوستانی بہار آتی ہے۔ لڑکے ڈور اور پتنگ کی خاطر باہم دست و گریباں ہوتے ہیں۔ کوئی مار کھاتا ہے اور کوئی ہنستا کھلکھلاتا ہے۔ خون میں جوش آتا ہے عشق و جنون کی مستی پیدا ہوتی ہے۔ اور دوسری جانب گھر میں ایک عصمت مآب شوہر پرست ہندوستانی عورت نے پھولوں کے زرد گہنے تو پہن لئے ہیں۔ لیکن شوہر پردیس میں ہے۔ اس لئے ؎

ہے مگر اداس
نہیں پی کے پاس
غم و رنج و یاس
دل کو پڑے ہیں سہنے

اسی طرح برسات آتی ہے تو جہاں باغوں میں بلبلوں کی بجائے کوئل کی کوکو اور پپیہے کی پی کہاں سنائی دیتی ہے وہاں آموں کے نیچے جھولے ڈال کر پینگیں بڑھانے والی ماہ پیکروں کے پیارے پیارے گیتوں کی میٹھی سریلی تانیں بھی فردوسِ گوش بنتی ہیں۔ ساتھ ہی حفیظ ننھی بچیوں کی ہنڈ کلھیا اور گڈے گڑیا کی شادی کو بھی نہیں بھولتا۔ ذرا یہ جھولے کا منظر دیکھئے کس قدر مانوس معلوم ہوتا ہے۔ اور شاعر کی نظر اس پر کس انداز میں پڑتی ہے لیکن ہندوستانی عورت کی نمایاں ترین خصوصیات اس کی مستی اور الھڑپنے کی ہر ترنگ میں بھی حفیظ کے پیشِ نظر رہتی ہیں۔ چنانچہ جھولا جھولنے والیاں ہنستے کھیلتے مسکراتے منہ چڑاتے

اور بڑھتے جاتے یکایک جھینپ بھی جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد ؎

اٹھلا رہی ہیں اترا رہی ہیں

خوبانِ ہندی حورانِ ارضی رونق گھروں کی

نازک دوپٹے رنگین ہلکے

سر پر سنبھالے شانوں پہ ڈالے

مینہ لاکھ برسے جی لاکھ ترسے

نکلیں نہ گھر سے

شوہر کے ڈر سے

پھر یہی نہیں بلکہ ؎

اپنی نظر سے شرما رہی ہیں

نغمہ زار کی ان نظموں اور جلوۂ سحر۔ تاروں بھری رات وغیرہ کو چھوڑ کر سوز و ساز کی نظموں کو دیکھئے تو ان میں بھی یہ مقامی رنگ اسی طرح نمایاں نظر آئے گا۔ پریت کا گیت۔ چاندنی میں کشتی۔ شامِ رنگیں۔ تپاک، سوزِ عشق اور چناب وغیرہ کو پڑھ کر قدیم اور موجودہ اردو شاعری سے مقابلہ کیجئے۔ زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس مقامی رنگ کے باوجود نظموں کی دلچسپی محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ غیر ہندی شائقینِ ادب کو بھی اس سے وہی حظ حاصل ہوگا جو خالص ہندوستانی شاعری سے ہونا چاہیے اور یہ حفیظ کی قادر الکلامی اور وجدانِ صحیح کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

تشبیہات و تلمیحات اور بحور و قوافی کے معاملہ میں بھی اردو شاعری اصولی نقائص سے خالی نہیں ہے۔ دوسری زبانوں میں تشبیہ و استعارہ اور تلمیحات کے مانوس ہونے کے باعث عوام الناس بھی شعر سے پورا پورا حظ حاصل کر سکتے ہیں اور شاعرانہ اشاروں کنایوں کو فوراً سمجھ لیتے ہیں لیکن ہمارے ہاں شاعری کی فضا اس قدر نامانوس ہوتی ہے کہ عوام تو درکنار خواص بھی شعر سے وہ لطف حاصل نہیں کر سکتے جو مانوس فضا میں ایک خاص تڑپ کا حامل ہوتا ہے۔ بحور و قوافی کا سلسلہ بہت بڑی

حد تک اجنبی ہے۔ چنانچہ ہندوستانی موسیقی اور اردو شاعری کے تال سم میں بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا بلکہ عروضیوں نے مسلسل غفلت بلکہ دانستہ بے اعتنائی روا رکھی ہے۔ حتیٰ کہ ہندوستانی گیت اردو شاعری کے نام نہاد عروضیوں کو اس لئے غیر موزوں معلوم ہونے لگتے ہیں کہ ان میں ملکی زحافات سے کام لیا جاتا ہے۔ کیا یہ افسوسناک بات نہیں کہ جو سُر اور تال ہندوستانیوں کے مزاج میں بسے ہوئے ہیں۔ ان کو تو اجنبی اور غیر مانوس گردانا جائے اور غیر مانوس زیر و بم ہمارے اشعار کی موزونیت یا عدم موزونیت کا معیار بنا لئے جائیں؛ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شعرا کو موزونیت کے قدرتی معیار سے کام لینے کے بجائے جس میں لازمی طور پر نسبتاً بہت جلد مہارت حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک اجنبی یا تقریباً اجنبی میزان کا استعمال سیکھنا پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو شعرا میں سے پانچ فی صدی بھی عروضی نکات سے کما حقہٗ واقفیت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

لیکن سوال صرف عروضی مہارت کا نہیں۔ اصل بحث یہ ہے کہ آیا یہ عربی اور ایرانی اوزان سب کے سب ہندوستانی کانوں کو مانوس اور پسندیدہ معلوم ہوتے ہیں؛ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض اوزان ہمارے ہاں پہلے ہی موجود ہیں یا کم از کم ہندوستان میں بھی خوشگوار معلوم ہو سکتے ہیں۔ ان سے ضرور کام لیا جائے لیکن جو اوزان قطعاً اجنبی اور نامانوس ہونے کے باعث ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ ان بھاری پتھروں کو چوم کر چھوڑ دیا جائے تو کیا حرج ہے؛ مثال کے طور پر بحر منسرح کو لیجئے۔ یہ عربی بحر ایرانی فضا میں بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایرانی شاعر اس بحر میں لکھا ہوا فارسی کلام اپنے مخصوص لہجہ میں پڑھ کر سنائے تو واقعی حظ حاصل ہوتا ہوگا لیکن اردو شاعری کے لئے یہ بحر نہ صرف اجنبی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس میں لکھتے ہوئے اردو اشعار کے متعلق غیر موزونیت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اس بحر کو زور طبع کی نمائش کے لئے ضروری سمجھتے ہوں۔ مگر اس نمائش کا نتیجہ "مغز ماخورد و خلق خود بدید" کے سوا کچھ نہیں۔ پس اگر ایرانی شعرا اس بحر پر جان چھڑکتے ہیں تو بچشم ما روشن دل ماشاد، لیکن ہمیں خواہ مخواہ پتھر ڈھونے کی کیا ضرورت ہے؟

میں یہ نہیں کہتا کہ حفیظ نے قدیم رنگ اور قدیم طرز سخن سے کوئی سروکار نہیں رکھا یا اجنبی عروض سے کامل بے اعتنائی کا برتاؤ کیا ہے۔ حفیظ کے ہاں بھی اردو شاعری کی قدیم خصوصیات موجود ہیں اور ایسا ہونا ضروری تھا کیونکہ حفیظ کو اپنی عمارت انہی بنیادوں پر کھڑی کرنی تھی اور وہ ماحول کے اثر سے بھی محفوظ نہیں رہ سکتا

تھا لیکن بمذاق حضرات پر کلام حفیظ کے مطالعہ سے فوراً واضح ہو جائے گا کہ قدیم رنگ میں بھی شاعر نے خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کرتے ہوئے تقریباً تمام فرسودہ بیانات کو ترک کر دیا ہے اور عام طور پر صرف انہی خصوصیات کو لیا ہے جو ہر لحاظ سے پسندیدہ یا کم از کم قابل برداشت تھیں۔ اس کے ساتھ ہی جدت کا پہلو اس قدیم رنگ میں بھی نمایاں ہے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شاعر اپنی زبان اور ادب کی خدمت دو طریقوں سے کر سکتا ہے۔ قدیم اور رائج الوقت طرز کی تکمیل میں حصہ لے کر یا نئی راہیں نکال کر۔ لیکن حضرت حفیظ کے متعلق بے تامل یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ہر دو طریق اختیار کئے اور دونوں پہلوؤں میں نہایت ہی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ قدیم اردو شاعری اور قدیم طرز سخن کی تکمیل و تزئین اور اصلاح و تہذیب کے سلسلے میں حفیظ کے کارنامے اس قدر اہم اور قابل قدر ہیں کہ اردو شاعری ہمیشہ ان کی ممنون احسان رہے گی لیکن حفیظ کا پروگرام یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ یہ تزئین و تہذیب ابتدا تھی۔ اس انقلاب کی جو حفیظ نے اردو شاعری میں پیدا کیا ہے اور جس کے بغیر ہمارا ادب بڑی حد تک پسماندہ تھا۔

[illegible] اردو ادب کا دامن مناظر فطرت کی تصویروں سے خالی ہے۔ اور گیت کا تو ذکر ہی جانے دیجئے یہ وہ صنف ہے جس کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں کی۔ حالانکہ شعر اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہندوستان یہ سوال کر سکتا ہے کہ موسیقی جو ہندوستانی طبائع پر زبردست اثر رکھتی ہے کیا اس کا اردو پر اتنا حق بھی نہ تھا کہ ہمارے شعراء اپنے سوز و گداز کا اظہار کرتے وقت اس سے کام لیتے؟

دنیا بھر کی زبانوں میں گیت کو ذوق و مستی اور سوز و گداز کا بہترین مظہر مانا گیا ہے۔ اردو شاعری میں حفیظ اس مخصوص صنف کا موجد ہے اور کامیاب موجد۔ اس کے گیتوں نے اردو شاعری میں ایک نئی لذت ایک نیا رس پیدا کر دیا ہے۔ اس کے قلم نے گیت کو وہ مقام بخشا ہے کہ اردو زبان ہمیشہ حفیظ کی احسان مند رہے گی۔

تقریباً یہی کیفیت حفیظ کے انداز "منظر کشی" کی ہے۔ وہ بحر اور وزن یا تشبیہ و استعارہ ہی نہیں اپنی نظم کے ایک ایک لفظ سے منظر کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ وہ اپنے پیش نظر منظر کے لئے ہر لحاظ سے مناسب بحر اور مناسب الفاظ استعمال کرتا ہے اور اسی طرح وہی کیفیت دوسرے پر وارد کر دیتا ہے جو خود اس کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

حفیظ کا فن یہ ہے کہ لفظ دوسرے لفظ پر، مصرع دوسرے مصرعے پر اور شعر دوسرے شعر پر اس طرح اضافہ کرتا ہے جس سے دیدۂ دل کے سامنے پوری تصویر بے نقاب ہوتی جاتی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لطافت اور سادگی اور دلآویزی کے ساتھ۔ کہ اس میں شاعر کی اپنی ذات اور گردوپیش کی خصوصیتیں زائل نہیں ہونے پاتیں منظرکشی کا یہ اسلوب نادر الکلامی اور قوتِ اختراع کا زبردست ثبوت ہے اس کو دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حفیظ کے اس نکتہ سنج نے "فطری شاعری" کی دنیا میں ایک بالکل نئے اور انقلاب انگیز باب کا اضافہ کیا ہے۔

بحور و قوافی کے متعلق حفیظ کا اجتہاد اس قدر اہم ہے کہ ان کی شاعری کی نمایاں ترین خصوصیت بن گیا ہے۔ ڈگر پرست قدامت پسندوں کے جذبات کا احترام اس سلسلہ میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے لیکن صرف اس قدر کہ دوسری جانب ہندوستانی کانوں کو سمع خراشی کی شکایت کا موقع پیدا نہ ہونے پائے۔ پھر انہوں نے بعض بحور و اوزان کو چھوڑ دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ ان کی جگہ نئے اوزان پیش کر کے اردو شاعری کے سرمایہ میں اضافہ اور میدان میں وسعت پیدا کی ہے۔ چند بحور و اوزان ترک کر دینا کسی باذوق شاعر کے لئے کچھ ایسی بڑی بات نہیں۔ اصل کام نئے اوزان کی تلاش کا تھا جس میں انتخاب اور انتخاب در انتخاب کی ایسی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے کہ ان پر قابو حاصل کر لینا حفیظ ہی کا کام تھا۔ ظاہر ہے کہ غیر مانوس اور سمع خراش اوزان کی بجائے محض چند ہندوستانی اوزان پیش کر دینا کافی نہ تھا۔ بلکہ ایسے نعم البدل منتخب کرنے کی ضرورت تھی۔ جنہیں اردو شاعری آسانی سے قبول کر سکے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ ان کی چولیں اردو شاعری کے موجودہ ڈھانچے میں بالکل ٹھیک بیٹھ جاتیں۔ پھر ان نئے اوزان کو کامیابی سے رواج دینے کے لیے ضروری تھا کہ کسی موضوع پر نظم لکھتے وقت ان منتخب اوزان میں سے بھی ایسا وزن منتخب کیا جائے جو نفسِ مضمون کے ساتھ پوری پوری مناسبت رکھتا ہو۔ آپ نے اپنی عمر کے کسی حصہ میں اس قسم کی داستانیں سنی ہوں گی کہ ایک مرتبہ جب کہ آسمان پر بادلوں کا نام و نشان تک نہ تھا اور آفتاب عالمتاب پوری شان سے جلوہ افروز تھا۔ بیجو باورا نے ملہار گایا اور آناً فاناً گھنگھور گھٹائیں اٹھ کر موسلا دھار مینہ برسانے لگیں۔ یا تان سین نے آدھی رات کو دیپک راگ چھیڑ دیا اور شہر بھر کے بجھے ہوئے چراغ خود بخود روشن ہو گئے۔ آپ ان داستانوں اور موسیقار کے متعلق مشہور و معروف

روایات کو ان گھڑنت ادراہام جہت کی فرضی یادگاریں جاہیں کہہ دیں لیکن موضوعِ کلام اور بحور واوزان کی باہمی مناسبت کی ضرورت اور اہمیت کی طرف جو اشارہ ان میں موجود ہے اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ دور کیوں جاؤ۔ خود مروّجہ بحور و اوزان میں سے بعض خاص اوزان کو اردو شاعری میں بھی بعض خاص موضوعات کے لئے مخصوص یا قابلِ ترجیح سمجھا جاتا ہے۔

حفیظ نے اس انتخاب میں جس بالغ نظری اور ذوقِ صحیح کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اردو شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ "بسنت" اور "ابھی تو میں جوان ہوں" کے "چلبلے" اوزان میں کس قدر مستی ہے، کتنا جوش ہے! "جلوۂ سحر" کے نفسِ مضمون سے قطعِ نظر صرف زیر و بم ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات خوابِ راحت سے بیدار ہو گئی ہے۔ اور ایک آخری انگڑائی لے کے، ساتھ تمام سستی اور غنودگی کو پرے جھٹک کر روزانہ معمولات کے لئے تیار ہو رہی ہے۔ دوسری جانب "تاروں بھری رات" سنتے وقت نہ صرف دنیا نے ہست و بود کے محوِ خواب ہونے یقین ہو جاتا ہے۔ بلکہ خود سامعین پر بھی غنودگی طاری ہونے لگتی ہے۔ "برسات" کی نظم جتنی دیر آپ سنتے رہیں گے یہی محسوس ہو گا کہ آپ برسات کے موسم میں کسی باغ کی سیر کر رہے ہیں۔ جھولا جھولنے والیاں ملہار گا رہی ہیں۔ اور ان کے ارمانوں بھرے گیت سُن کر دل میں ہُوک سی اُٹھ رہی ہے۔

اسی طرح سوز و ساز کی نظموں میں "فرشتہ کا گیت" دیکھئے اس کا وزن آسمانی نغموں کے لئے کس قدر موزوں ہے! کانوں کے ساتھ دل بھی یہی محسوس کرتا ہے کہ ایک رحمت کا فرشتہ ہاتھ میں چھوٹی سی ستار لئے بے خودی کے عالم میں تانیں اڑاتا پھر رہا ہے۔

دیکھ اس دنیا کا نظارہ

میرے ساز کے تاروں میں

"برہت" کے گیت "میں" "پریم رس" کی مسلسل "قطرہ زنی" "دل کو بغض و عناد کے میل سے پاک کرتی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اس قطرے کے آگے آگے نظم کا وزن دل میں پریم رس کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا جاتا ہے "جنگِ سوزِ عشق" کو پڑھئے شاعر کے ساتھ نظم کا وزن بھی فریاد کر رہا ہے "شہید ارض کربلا"۔ ایسی نظمیں عام طور پر صرف اظہارِ عقیدت کے لئے لکھی جاتی ہیں لیکن حفیظ نے دوسرے ضروری محاسن کو نظر انداز نہیں کیا۔ اور اس نظم

کے وزن پر غور کرو۔ محض اصوات سے میدانِ جنگ کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ میں بخوفِ طوالت دوسری نظموں کے ذکر اور تفصیلی بحث سے احتراز کرتا ہوں۔ کتاب آپ کے سامنے ہے۔ خود پڑھ کر مختلف نظموں کے بحور و اوزان کی مناسبت کا اندازہ کر لیجئے۔ البتہ یہ عرض کر دینا ضرور ہے کہ یہ سب کچھ خود بخود بلا ارادہ نہیں ہو گیا۔ بلکہ شاعر کے حسنِ انتخاب کا نتیجہ ہے۔ حفیظ کو اس "حسن" کی ضرورت و اہمیت اور حسنِ انتخاب میں اپنی کاوش و کامیابی کا پورا پورا احساس ہے اور وہ بالکل بجا دعویٰ کرتا ہے۔

کیا پابندِ نَے نالے کو میں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

حفیظ کے اس دعوے کی صحت اور اس طرزِ خاص کے اُن ایجاد ہونے کا سب سے نمایاں ثبوت اس دنیا میں موجود ہے جو ان کے مخالفوں نے اپنے قصرِ شہرت کی بنیادوں کو متزلزل دیکھ کر اختیار کیا تھا۔ یہ سیلاب اس قدر اچانک آیا کہ یہ لوگ بھونچکے رہ گئے اور اس بوکھلاہٹ میں نئی شاعری کی تمام خصوصیات سے آنکھیں بند کر کے "پراپگنڈا" کرنے لگے کہ حفیظ کی کامیابی اور روز افزوں مقبولیت محض اس کی پُر ترنم آواز کا نتیجہ ہے۔ اس "پراپگنڈے" میں اس قدر شدت سے کام لیا گیا کہ خود پراپگنڈا کرنے والوں کو بھی اپنے دعووں کی صداقت کا یقین سا ہو گیا۔ چنانچہ اس غلط فہمی کے ماتحت لاہور میں مدتوں گلے بازی ہوتی رہی جس کسی کی آواز میں ذرا سا لوچ تھا وہی شاعر بن بیٹھا اور اُلٹی سیدھی تک بندیوں کو گا بجا کر اردو ادب میں "بے بہا اور قابلِ فخر اضافہ" کرنے لگا۔ شعر اور نغمہ میں جو گہرا تعلق ہے اس سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن نغمہ بذاتِ خود شعر نہیں کہلا سکتا۔ حضرت امیر خسرو نظم کو عروسِ خوب اور نغمہ کو اس کا زیور قرار دے کر فرماتے ہیں ؎

عیب نبود گر عروسِ خوب بے زیور بود

پس اگر عروسِ خوب "با زیور" ہو تو سبحان اللہ اور اگر بے زیور ہو تو بھی کوئی حرج نہیں لیکن عروس کا "خوب" ہونا ضروری ہے۔ بلکہ میرے خیال میں تو عروسِ خوب کو بھی کوئی زیور اسی صورت میں زیب دے سکتا ہے۔ جب کہ وہ اس کے تمام دوسرے محاسن سے پوری پوری مناسبت رکھتا ہو۔ ورنہ زیور کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ایک پری چہرہ خاتون کو انگریزی لباس پہنا کر گلے میں سیر سوا سیر کی ہندوستانی ہیکل باندھ دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے

حفیظ کی شاعری کے متعلق موضوع کلام نفسِ مضمون طرزِ سخن اور وزن کی باہمی مناسبت کو اس قدر اہمیت دی ہے کاش یہ لوگ ہی زیر کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے پہلے ان شعری محاسن کی فکر کرتے جو حفیظ کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس صورت میں ایک طرف تو اُردو ادب اور اُردو شاعری کے سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ ہوتا اور دوسری جانب ان کا سارا کھیل "خوش گلو ایکٹروں اور "فوق البھڑک سین سینری" کے باوجود اس طرح ناکام نہ رہتا۔

مخالفوں کی آنکھوں پر تو خیر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن افسوس یہ ہے کہ بعض مبتدی مداح بھی اس رَو میں بہ گئے۔ کہنے کو تو یہ حضرات حفیظ صاحب کا تتبع کر کے زعمِ خود اردو ادب اور اردو شاعری کی خدمت میں مصروف تھے۔ مگر یہ سمجھنے کی زحمت انھوں نے کبھی گوارا نہ فرمائی کہ صرف ؎

ٹپ ٹپ ٹپا ٹپ

مینہ برسا دھار

کہہ دینے سے بارش کا سماں نہیں بندھ سکتا۔ بلکہ برسات کی فضا پیدا کرنے کے لئے ترنم کے علاوہ بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔ اور جب تک وہ چیزیں موجود نہ ہوں۔ ترنم محض "تاتا ریزی" کا بے ہنگم سا ہنگامہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ بہر صورت اگر یہ نوجوان بجائے ترنم ہندوستانی بہروپ والی نظموں پر بس کرتے اگر اس کا عشر عشیر بھی دوسری نظموں مثلاً "فرصت کی تلاش" "آزادی" "ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح" "دردِ خیبر" "چاندنی میں گشتی" "شام زندگی" وغیرہ پر صرف کرتے۔ بلکہ خود ترنم بھری والی نظموں ہی کو کوچے کی بجائے شاعر کی آنکھوں سے دیکھتے تو ان پر حفیظ کی شاعری کے تمام محاسن اور حفیظ کی کامیابی کا حقیقی راز بہت جلد کھل جاتا۔

اس مقصد کے لئے حفیظ کی غزلوں کا مطالعہ خاص طور پر کارآمد ثابت ہو سکتا ہے لیکن تتبع کرنے والے اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ "ہفت پیکر" حفیظ کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے مقدمہ میں سید امتیاز علی صاحب تاج لکھتے ہیں :-

"جو لوگ حضرت حفیظ کو بحیثیت شاعر جانتے ہیں اگر ان سے کہا
بھی جائے کہ حفیظ کے افسانے ان کی شاعری سے کم قابلِ قدر نہیں

ترنی الحال کوئی اس پہ غور کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوگا۔ لوگ حفیظ کی شاعری سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں۔ کہ اب انہیں کسی دوسری حیثیت میں دیکھ کر داد دینے کی مطلق گنجائش نہیں رہی۔۔ ہمیشہ سے یوں ہی ہوتا آیا ہے۔۔۔ دُنیا صرف ایک ہی حیثیت سے کسی کو غیر معمولی داد دیا کرتی ہے۔ بیک وقت دو حیثیتوں سے اعتراف کمال کرنا ان کی بساط سے باہر ہے۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کا حوصلہ اس سے بھی زیادہ تنگ ہے وہ شاعری میں بھی مختلف اصناف سخن کے متعلق حفیظ کے کمال کا اعتراف کرنے سے قاصر رہی ہے مثلاً غزل ہی کو لیجئے "یاران نکتہ داں" کے نزدیک غزل گوئی میں حفیظ کا مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو لیکن لوگ ان کی نظموں (بلکہ صرف مترنم مجرد والی نظموں) سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ ان کو اب تک ان محاسن کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جن کی بنا پر ماہرین فن حفیظ کو غزل میں بھی صاحب طرز تسلیم کرتے ہیں۔

اسی طرح اگر ان نظموں کو دیکھیں جو حفیظ نے بچوں کے لئے لکھی ہیں۔ تو شاعری کی اس صنف میں بھی حفیظ مخترع نظر آئے گا۔ خصوصاً جو نظمیں صغیر السن بچوں کے لئے ہیں۔ ان میں تو شاعر نے کمال اختراع کا حیرت انگیز ثبوت دیا ہے لیکن دُنیا کو یہاں بھی اعتراف کمال کی توفیق نہیں ہوئی۔

میں مثالیں دے دے کر حفیظ کی امتیازی خصوصیات اور عام محاسن شعری پر تفصیلی بحث سے احتراز کرتا ہوں۔ ان کے متعلق پروفیسر تاثیر اور دیگر حضرات تھوڑا بہت لکھ چکے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بہت کچھ لکھا جائے گا۔ مزید برآں یہ دیباچہ تو مجمل اشاروں ہی میں کافی طویل ہو گیا ہے۔ لیکن جو لوگ حفیظ کے کلام کا بغرض استفادہ مطالعہ کرنا چاہیں۔ ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ صرف کسی خاص صنف میں شاعر کے نمونۂ کمال اور اس نمونہ کی بھی محض ایک آدھ خوبی سے متاثر ہو کر بس اسی کے نہ ہو رہیں۔ بلکہ جن اصناف سخن میں حفیظ نے طبع آزمائی کی ہے ان سب کے مختلف نمونوں کا بہ نظر امعان مطالعہ کریں۔ ہر نظم اور ہر غزل میں ان کو وہ تمام شعری لوازم نظر آئیں گے۔ جن کے متناسب مجموعہ کا نام شعریت ہے۔ ان لوازم کے ساتھ ان کو اس تناسب کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔

جس کے باعث حفیظ اور شعریت گویا مترادف بن گئے ہیں۔ حفیظ کی کامیابی کا راز یہی شعریت ہے جو ترنم کی خانہ زاد نہیں بلکہ خالق ہے ؛

اختر

آج ہی یہ پروف، لاہور سے کراچی تصحیح کے لئے پہنچے
آج ہی شام دہلی سے خبر آگئی کہ پنڈت ہری چند
اختر کا انتقال ہوگیا۔ ہاں میں زندہ ہوں پروف پڑھ
رہا ہوں

حفیظ ۲ر جنوری ۱۹۵۸ء

"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

صحرا کے مسافر

فسوں باطل ہوا شب کے طلسماتی نظاروں کا
سحر کے جاگتے ہی اڑ گیا ڈیرا ستاروں کا

بیاباں کے عظیم الشان منظر سے اٹھے پردے
کہ جیسے دل میں کوئی اک نظر سے معرفت بھر دے

ہوائے شوق کے آزاد جھونکے سر اٹھاتے ہیں
چمک اٹھنے کی امیدوں میں ذرے مسکراتے ہیں

یہ جنت کا سماں بس اک دو ساعت رہنے والا ہے
کہ صحرا پھر وہی شدت کی حدت سہنے والا ہے

یہاں اب ایک ساعت بیٹھنا بھی ہاں کھٹکتا ہے
طلوعِ مہر سے پہلے ہی پہلے کوچ ہوتا ہے

ہوائے گرمیاں جب ریت کے طوفاں اٹھاتی ہیں
بیاباں گردشوں کی نئی دنیا بساتی ہیں

چلے جب دشت میں بادِ سموم اک قہر ہے گویا
یہ اونٹوں اور انسانوں کے حق میں زہر ہے گویا

اٹھو آسودگانِ دشتِ غربت خوابِ غفلت سے
کرو تجدید پیمانِ وفا عزم اور ہمت سے

مبادا دن نکل آئے مبادا دھوپ چڑھ جائے
یہاں بیٹھے رہیں ہم، قافلہ کچھ اور بڑھ جائے

انہی ذرّوں کی چھاتی سے کرن سورج کی پھوٹے گی
جو پیچھے رہ گئے ہیں اُن پہ بجلی بن کے ٹوٹے گی

دُعا مانگو بیاباں میں کوئی تنہا نہ رہ جائے
مسافر کو خدا اس دھوپ کی سختی نہ دکھلائے

یہ وہ منزل ہے کوسوں تک یہاں پانی نہیں ملتا
بسا اوقات رستہ بھی بآسانی نہیں ملتا

ابھی دُنیائے انساں ایک صحرا کے سوا کیا ہے
ابھی چاروں طرف دورِ ہلاکت کا رفرما ہے

تمنّائے حصولِ اقتدارِ شخصی و ذاتی
ابھی تک ہے بشر کو اک زوالِ ناچ نچواتی

بگولے نفسی نفسی کے مسلسل رقص فرماتے
ابھی اپنے شکم کی بھٹیاں بھرتے ہیں گرماتے

ابھی ہیں شعلہ ہائے آتشیں جذباتِ نفسانی
ابھی جنّات ہی کے روپ میں ہے نوعِ انسانی

اٹھو کیا سوچ ہے کیوں عازمِ منزل نہیں ہوتے
مدینے کے مسافر اس قدر کاہل نہیں ہوتے

مدینے تک پہنچ جاؤ تو پھر راحت ہی راحت ہے
یہ دُنیا ایک صحرا ہے مدینہ باغِ جنّت ہے

راوی میں کشتی

بن گیا ہے آسماں ٹھہرے ہوئے پانی کی جھیل
یا کسی ساحر نے ساکن کر دیا دریائے نیل

کوئی لہر اُٹھتی نہیں اِس بحرِ حیرت جوش میں
بزمِ انجم غرق ہے موسیقیٔ خاموش میں

کس قدر یہ نیلگوں وسعت سکوت انگیز ہے
جس کے اندر چاند کا چہرہ تجلی ریز ہے

رات کے افسوں میں گم ہو گئی ہے کائنات
یہ گماں ہوتا ہے شاید سو گئی ہے کائنات

شہدرے کے نوحہ خواں مینار بھی خاموش ہیں
مقبرہ بھی، باغ بھی، اشجار بھی خاموش ہیں

اِک طرف سائے کو لپٹائے ہے پُل سویا ہوا
چاندنی پر ریت کا ہے جزو و کل سویا ہوا

اُس طرف اجڑی ہوئی بارہ دری خاموش ہے
اِک گئے گزرے پُرانے خواب میں بے ہوش ہے

اوڑھ کر مغموم بیوہ کی طرح چادر سفید
کروٹیں لیتی ہے راوی ناشکیب و ناامید

سینۂ جذبات ہے کہ دل میں ہلکا ہلکا درد ہے
یہ ہوا کیا ہے لبِ راوی پہ آہِ سرد ہے

نغمہ سویا بربطِ آبِ رواں کی گود میں
جس طرح اِک طفل سو جاتا ہے ماں کی گود میں

چاند بالائے فلک ہے، چاند زیرِ آب ہے
چاند ہی ساکن ہے لیکن چاند ہی بیتاب ہے

چاند کو گھیرے ہیں لے کر بہہ رہی ہے چاندنی
کوئی خواب آور کہانی کہہ رہی ہے چاندنی

اور اس چاندی کے دھارے پر بہا جاتا ہوں میں
خواب کے عالم میں سب کچھ دیکھتا جاتا ہوں میں

یہ مری کشتی بھی گویا خواب کا آغوش ہے
میں کسی عالم میں بیٹھا ہوں بس اتنا ہوش ہے

دو طرف خاموش اور تاریک ساحل ہیں رواں
اِس روانی پر روانی کا نہیں ہوتا گماں

چپکے چپکے دوسری جانب چلے جاتے ہیں یہ
میری کشتی کے جلو میں کیوں نہیں آتے ہیں یہ

میں کہاں جاتا ہوں شاید یہ نہیں معلوم اِنہیں
آنکھ سے فطرت نے رکھا ہے مگر محروم اِنہیں

دُور اُفق پر اِک نیا منظر ہے میرے سامنے
زندگانی کا رُخِ انور ہے میرے سامنے

میں وہاں جاتا ہوں نیندیں ٹوٹ جاتی ہوں جہاں
حسرتیں اُمید کے جلوے دکھاتی ہوں جہاں

شامِ رنگین

پچھم کے در پہ سورج بستر جما رہا ہے
رنگین باونے میں چہرہ چھپا رہا ہے

کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو
پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو

عکسِ شفق نے کی ہے اِس طرح زر فشانی
گھل مِل کے بہ رہے ہیں ندی میں آگ پانی

اوڑھے سیہ دوپٹے سرسبز وادیوں نے
زیور اُتار ڈالے گلزار زادیوں نے

چھایا ہے تھوڑا تھوڑا پیڑوں تلے اندھیرا
چڑیوں نے کھیت چھوڑا لینے چلیں بسیرا

کلیوں کے قہقہوں سے معمور ہیں ہوائیں
پریوں کی لوریاں ہیں یہ رس بھری صدائیں

لپٹی ہوئی ہیں سیندیں کیف آفریں ہوا میں
خاموشیوں کی لہریں اُٹھنے لگیں فضا میں

گم ہو چلی ہے دنیا بکھرے ہوئے سکوں میں
دن غرق ہو رہا ہے چپ چاپ نیلگوں میں

کھیتوں میں کام کر کے لوٹے ہیں گام والے
چادر سروں پہ ڈالے کندھوں پہ ہل سنبھالے

اب شام آگئی ہے جاگے ہیں بھاگ اِن کے
ہر سمت گونجتے ہیں رستوں پہ راگ اِن کے

لے لے کے ڈھور ڈنگر چرواہے آ رہے ہیں
سیٹی بجا رہے ہیں اور گیت گا رہے ہیں

کم سن سہیلیوں کا پنگھٹ پہ جمگھٹا ہے
جانے اکیلیوں کا دن کس طرح کٹا ہے

یہ بار بار باتیں، یہ بار بار ہنسنا
یہ بے شمار باتیں، یہ بے شمار ہنسنا

اِک گدگدا رہی ہے، چھینٹے اُڑا رہی ہے
اِک بھر چکی ہے پانی، گاگر اُٹھا رہی ہے

شرما کے اِک نے اوڑھے منہ پر ہنسی کے مارے
رنگین اوڑھنی کے بھیگے ہوئے کنارے

شرم و حیا کی سُرخی چہرے پہ چھا رہی ہے
شام اُس کو دیکھتی ہے اور مسکرا رہی ہے

چناب

وہ بلندی جس پہ ہیں نورانیوں کی بستیاں
برف کی آبادیاں برفانیوں کی بستیاں

نغمے سوتے ہیں جہاں خاموشیوں کے ساز میں
محو تھا مَیں بھی وہاں اِک روز خوابِ ناز میں

دفعتہً ٹوٹا مرے مجبور خوابوں کا طلسم
بن گئی ہستی مری یکسر بیابوں کا طلسم

گرمیٔ رفتار نے چھیڑا مجھے مضراب سے
گونج اُٹھے کہسار میرے نغمۂ بیتاب سے

مَیں اُتر آیا فرازِ کوہ سے گاتا ہُوا
اپنی متوالی روش میں ٹھوکریں کھاتا ہُوا

پاسبانوں نے بہت کچھ ہیبت سے روکا مجھے
یعنی ہیبت ناک دیووں نے عبث ٹوکا مجھے

کچھ نہ بن آیا مری سعیِ عمل کے سامنے
میری رَو میں بہ گئے آئے جو مجھ کو تھامنے

اَبر نے آنسو بہا کر مجھکو رخصت کر دیا
اور اپنے موتیوں سے میرا دامن بھر دیا

دولتِ کہسار لے کر دامنِ سیلاب میں
آخرِ کار آ بسا مَیں خطۂ پنجاب میں

مدّتیں گذری ہیں اس فردوس میں رہتا ہوں میں
یہ پری زادوں کی وادی ہے یہاں بہتا ہوں میں

اس زمیں پر چاہنے والے مرے آباد ہیں
شاد ہیں دونوں کنارے ہر طرح سے شاد ہیں

ان کے دل روشن ہیں سچی دوستی کی آگ سے
ان کے گیتوں کی صدا ملتی ہے میرے راگ سے

میرا افسانہ بندھا ہے اِن کے افسانوں کے ساتھ
شمع وابستہ ہو جیسے اپنے پروانوں کے ساتھ

حُسن و صُورت، عشق و اُلفت کا نہیں کال اس جگہ
ہر طرف آباد ہیں سوہنی مہینوال اس جگہ

لُوٹتے ہیں میری موجوں پر کئی کچے گھڑے
روز دکھلاتے ہیں اک الفت نئی کچے گھڑے

یہ ہوا لہروں سے ہے جو محوِ شکست و بست ہے
ہر نئے رانجھے کی میٹھی بانسری سے مست ہے

ہر دوشیزہ دکھتی ہے مجھ میں نقشہ ہیر کا
بن گیا ہوں آئینہ میں ہیر کی تصویر کا

گھیرتی ہیں مجھ کو ان سادہ دلوں کی ٹولیاں
بھولی بھولی صورتیں ہیں، میٹھی میٹھی بولیاں

اپنے بچے جانتا ہوں پالتا ہوں میں انہیں
جو طلب کرتے ہیں یہ دے ڈالتا ہوں میں انہیں

میرے بچوں کی طرح آتے ہیں میری گود میں
کھیلتے ہیں اور سو جاتے ہیں میری گود میں

اِن کو طوفانِ حوادث سے بچا لیتا ہوں میں
اپنے دامانِ محبت میں چھپا لیتا ہوں میں

ہاں میں پنجابی ہوں اُلفت ہے مجھے پنجاب سے
خوش ہوں میں پنجابیوں کی شورشِ بیتاب سے

ہمالیہ

یہ دُنیا اللہ اللہ کس قدر آزاد دنیا ہے
یہی دُنیا ہے جس کے فیض سے آباد دُنیا ہے

یہ اُونچی چوٹیاں نُورانیوں کی بارگاہیں ہیں
یہ سب تنبو ٹیاں برفانیوں کی کارگاہیں ہیں

یہ منزل ہے ہواکے برشگالی کاروانوں کی
یہیں پر ختم ہوتی ہے بلندی آسمانوں کی

کوئی خاکی قدم اس خاک پر آیا نہیں اب تک
فرشتوں کی عبادت گاہ ہے یہ سرزمیں اب تک

یہاں آکر زمیں نے آسماں کی ہمسری کر لی
یہاں مٹی نے حاصل دو جہاں کی سروری کر لی

یہ اُونچے شامیانے دستِ قدرت نے لگائے ہیں
یہ لاتعداد خیمے سبز مخمل سے سجائے ہیں

یہ دیودارو ں کا جنگل قدرتی پریوں کی بستی ہے
یہاں خاموشیاں اُگتی ہیں موسیقی برستی ہے

یہاں گھلتی ہوئی چاندی کے فوارے اُبلتے ہیں
یہاں سوتے نکلتے ہیں یہاں چشمے اُبلتے ہیں

یہاں آ کر ہوائیں دامنوں میں رنگ بھرتی ہیں
گھٹائیں بن کے اٹھتی ہیں فلک سے جنگ کرتی ہیں

کوئی دیکھے یہاں آ کر تبسم لالہ زاروں کے
ترنم جوئباروں کے تکلم آبشاروں کے

یہ شادابی خزاں نا آشنا معلوم ہوتی ہے
شگفتہ ہر طرف شانِ خدا معلوم ہوتی ہے

یہاں چاروں طرف خاموشیوں کا حشر برپا ہے
جہاں تک دیکھیے بس ایک نورانی اندھیرا ہے

حفیظ اکثر یہاں میں اپنی ہستی بھول جاتا ہوں
خدا کی قدرتوں میں خود پرستی بھول جاتا ہوں

صبح و شامِ کوہسار

کس قدر ہنگامہ پرور ہے سکوتِ کوہسار — کارپردازانِ قدرت ہیں یہاں مصروفِ کار

رفعتوں پر رفعتیں ہیں پستیوں میں پستیاں — کس قدر آباد ہیں برفانیوں کی بستیاں

اک بڑے قانون کی تعمیل ہوتی ہے یہاں — قسمتِ آب و ہوا تبدیل ہوتی ہے یہاں

گوشے گوشے میں ہیں قائم کارخانے ابر کے — بن رہے ہیں تن رہے ہیں شامیانے ابر کے

وقت بے چارہ یہاں پابند ہے مجبور ہے — اس مشقت گاہ کا ادنیٰ سا اک مزدور ہے

آسماں گردش میں ہے دو کام کرنے کے لئے
صبح کرنے کے لئے یا شام کرنے کے لئے

صبح

صبح کا یہ فرض ہے معمول پہ آیا کرے — جس قدر سونا فراہم کرسکے لایا کرے

65370

کھول دیتی ہے زرِ خالص کی دُکانیں سحر
لاکے رکھ دیتی ہے سونے کی چٹانیں شرق پر

کیمیا سازانِ چرخ اُٹھتے ہیں اپنے کام کو
آگ کی بھٹی میں رکھتے ہیں طلائے خام کو

دفعتاً شعلے نظر آتے ہیں یا رنگیں دھواں
چوٹیاں مشرق کی ہو جاتی ہیں سب آتش فشاں

دیکھتے ہی دیکھتے ہوتا ہے سونے کا یہ حال
کوئی شے پگھلی ہوئی کچھ قرمزی کچھ لال لال

حکم یہ ہے اس میں جو ناقص ہے پچھن جایا کرے
اور باقی اِک طلسمی گیند بن جایا کرے

بعض چابکدست شاگردانِ استادِ ازل
کرتے ہیں اس گیند میں نیرنگ بھرنے کا عمل

جب پہاڑوں سے ابھرتا ہے یہ بقعہ نُور کا
حُسن خود کرتا ہے نظارہ قریب و دُور کا

کارگہ کا باز و بیٹھتے ہیں اُٹھ کر نُور باف
ذرّے ذرّے پر چڑھا دیتے ہیں نُورانی غلاف

یہ طلسمی گیند بنتا ہے نار آمیز نُور
زندگی کی گرم بازاری کا ہوتا ہے ظہور

شام

رفتہ رفتہ سُرخیوں پر چھا گیا کالا غبار
مٹ گیا رنگِ شفق مرجھا گیا یہ لالہ زار

نُور کے زریں ایوانوں میں تالے پڑ گئے
ارغوانی بدلیوں کے رنگ کالے پڑ گئے

شام آئی ہے سکوں کا جال پھیلائے ہوئے
ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے

بے زباں خاموشیاں جاگیں صدائیں سو گئیں
شورشیں چپ ہو گئیں خاموشیوں میں کھو گئیں

کوہ پر ظلمات کی پریوں نے پر پھیلا دیئے
ہر طرف تاریک دامن کھول کر پھیلا دیئے

ایک پُر اسرار خاموشی فضا میں بس گئی
اِک سُبک رفتار مدہوشی ہوا میں بس گئی

جھاڑیاں کالی ردائیں اوڑھ کر چپ ہو گئیں
بند کلیاں اپنی خوشبو سے لپٹ کر سو گئیں

اِس طرح اونچے پہاڑوں میں گھری ہیں وادیاں
جس طرح دیووں کے گھر میں قید ہوں شہزادیاں

شاعر

فتنۂ خفتہ جگانے اس گھڑی کس کی مجال
قید میں شہزادیاں کوئی نہیں پرسانِ حال

اِن غریبوں کی مدد پر کوئی آمادہ نہیں
ایک شاعر ہے یہاں لیکن وہ شہزادہ نہیں

آہوؤں کی سرگیں ہلکیں فضا پر حکمراں
چھائی ہیں ارض و سما پر آہنیں سی جالیاں

دور سے کوہسار وادی پر یہ ہوتا ہے گماں
اونٹ ہیں بیٹھے ہوئے اُترا ہوا ہے کارواں

یا اژدہے آسمانِ پیر پر برسات کے
خیمۂ بوسیدہ میں پیوند ہیں بانات کے

اور اِس خیمے کے اندر زندگی سوئی ہوئی تیرگی سوئی ہوئی تابندگی سوئی ہوئی

اَے حفیظ! ان نیند کے ماتوں کی منزل سے نکل کام ہے درپیش۔ دائم دیدہ و دل سے نکل

دیدہ و دل کو بھی غفلت کے شبستاں سے نکال یہ جو خاموشی کی زنجیریں ہیں ان کو توڑ ڈال

صبح کرنے کے لئے پھر ہاؤ ہُو درکار ہے

شکر کر۔ سوتی ہوئی دنیا میں تُو بیدار ہے

شہسوارِ کربلا

لباس ہے پھٹا ہوا غبار میں اٹا ہوا
تمام جسمِ نازنیں چھدا ہوا کٹا ہوا
یہ کون ذی وقار ہے، بلا کا شہسوار ہے
کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

یہ جس کی ایک ضرب سے کمالِ فنِ حرب سے
کئی شقی گرے ہوئے تڑپ رہے ہیں کرب سے

غضب ہے تیغۂ دوسر کہ ایک ایک وار پر
اُٹھی صدائے الاماں، زبانِ شرق و غرب سے

یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

یہ مردِ حق پرست ہے مئے رضا سے مست ہے
کہ جس کے سامنے کوئی بلند ہے نہ پست ہے

اُدھر ہزار گھات ہے۔ مگر عجیب بات ہے
کہ ایک سے ہزار ہا کا حوصلہ شکست ہے

یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

عبا بھی تار تار ہے تو جسم بھی فگار ہے
زمیں بھی ہے تپی ہوئی فلک بھی شعلہ بار ہے

مگر یہ مردِ تیغ زن، یہ صف شکن فلک فگن

کمالِ صبر و تن دہی سے محوِ کارزار ہے

یہ بالیقیں حسینؑ ہے

نبیؐ کا نورِ عین ہے

دلاوری میں فرد ہے بڑا ہی شیر مرد ہے
کہ جس کے دبدبے سے دشمنوں کا رنگ زرد ہے

حبیبِ مصطفیٰؐ ہے یہ مجاہدِ خدا ہے یہ

جبھی تو اس کے سامنے یہ فوج گرد گرد ہے

یہ بالیقین حسینؑ ہے

نبیؐ کا نورِ عین ہے

اُدھر سپاہِ شام ہے ہزار انتظام ہے
اُدھر ہیں دشمنانِ دیں اِدھر فقط امام ہے
مگر عجیب شان ہے، غضب کی آن بان ہے
کہ جس طرف اُٹھی ہے تیغ بس خدا کا نام ہے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

لاہور

(تصویر کا ایک رُخ)

خطۂ لاہور یعنی جنّتِ ہندوستاں　　جس کی خوبی سے ہے خاکِ پاک پنجاب آسماں

ہے تو یہ جنّت مگر انسان بستے ہیں یہاں　　خُلد سے نکلے ہوئے ارمان بستے ہیں یہاں

صُورت و معنی بہم محوِ نیاز و ناز ہیں　　حُسن کے پہلو بہ پہلو عشق کے انداز ہیں

حُسن پھرتا ہے یہاں اٹھکیلیاں کرتا ہُوا　　سادگی کو بے حجابی سے عیاں کرتا ہُوا

عشق ہر مُوسم تماشا گاہ میں آوارہ ہے　　زخم خوردہ ہے بہت آزردہ ہے بیچارہ ہے

اِک طرف قاتل نگاہیں تیر برساتی ہوئی　　اِک طرف مجبُور آہیں دل کو دہلاتی ہوئی

یہ وہ میخانہ ہے جس میں ساقیانِ مے فروش　　پھر رہے ہیں ہر طرف ساغر بکف مینا بدوش

پینے والے پے بہ پے آتے ہوئے جاتے ہوئے — گنگناتے لڑکھڑاتے ٹھوکریں کھاتے ہوئے

ولولے اٹھتے ہوئے بڑھتے ہوئے چڑھتے ہوئے — ردِّ آفات و بلا کی سیفیاں پڑھتے ہوئے

جلوہ آرا ہیں یہاں کیفیتیں پنجاب کی — سینۂ فولاد میں خاصیتیں سیماب کی

آب و گل میں زندگی ہنگامہ آرا ہے یہاں

موت بھی چاہے تو جینے کا سہارا ہے یہاں

توبہ نامہ

آہ وہ راوی کا کنارا، وہ گھٹا چھائی ہوئی
شام کے دامن میں سبزے پر بہار آئی ہوئی
وہ شفق کے بادلوں میں نیلگوں سرخی کا رنگ
اور راوی کی طلائی نقرئی لہروں میں جنگ
شہ دے رہے ہیں آم کے پیڑوں پہ کوئل کی پکار
ڈالیوں پہ سبز پتوں سرخ پھولوں کا نکھار
وہ گلابی عکس میں ڈوبی ہوئی چشمِ حباب
اور نشے میں مست وہ سرمست نوجوں کے لب باب
وہ ہوا کے سرد جھونکے شوخیاں کرتے ہوئے
بن پیئے بدمست کر دینے کا دم بھرتے ہوئے

دُور سے ظالم پپیہے کی صدا آتی ہوئی
پے بہ پے کم بخت پی پی کہہ کے اُکساتی ہوئی
اور وہ مَیں ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر بیٹھا ہُوا
دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر بیٹھا ہُوا
شیخ صاحب! سچ تو یہ ہے اُن دنوں پیتا تھا میں
اُن دنوں پیتا تھا یعنی جن دنوں جیتا تھا میں
اب وہ عالم ہی کہاں ہے مَے پئے مدّت ہوئی
اب میں تو یہ کیا کروں، توبہ کیے مدّت ہوئی

کیا پابندِ نَے نالے کو بیں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

جاگ سوزِ عشق

جاگ سوزِ عشق جاگ!
جاگ سوزِ عشق جاگ!
جاگ کام دیوتا! فتنہ ہائے نو جگا
بجھ گیا ہے دل میرا پھر کوئی لگن لگا
سرد ہو گئی ہے آگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ!

پڑ گئی دِلوں میں پھوٹ　　کیا بجوگ پڑ گیا
پرتھوی پہ چار کوُنٹ　　ایک سوگ پڑ گیا
سرنگوں ہے شیش ناگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

○

جاگ سوزِ عشق جاگ

تُو نے آنکھ بند کی　　کائنات سو گئی
حُسن خود پسند کی　　دن سے رات ہو گئی
زرد پڑ گیا سُہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ!

اب نہ وہ سفر نہ سیر　　رہبری نہ رہزنی
کچھ نہیں ترے بغیر　　دوستی نہ دشمنی

اب لگاؤ ہے نہ لاگ!
جاگ سوزِ عشق جاگ

○

جاگ سوزِ عشق جاگ

اے مغنّیِ شباب　　جاگ خوابِ ناز سے
دل شکستہ ہے رباب　　عرصۂ دراز سے

مر گئے قدیم راگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ

تو جو چشم وا کرے ہر اُمنگ جاگ اُٹھے
آہ و نالہ جاگ اُٹھے راگ رنگ جاگ اُٹھے

جوگ سے ملے بِہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

○

جاگ سوزِ عشق جاگ!

پھر اُسی اُٹھان سے تیر اُٹھے کمان اُٹھے
صبر کی زبان سے شورِ الاماں اُٹھے

جاگ اُٹھیں دلوں کے بھاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ اے نظر فروز! جاگ اے نظر نواز!

جاگ اے زمانہ سوز! جاگ اے زمانہ ساز!

جاگ نیند کو تیاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ!

کرشن بنسری

بنسری بجائے جا

کاہن مُرلی والے نند کے لال

بنسری بجائے جا

بنسری بجائے جا

پریت میں لسی ہوئی اداؤں سے

گیت میں لسی ہوئی صداؤں سے

برج باسیوں کے جھونپڑے بسائے جا

سُنائے جا سُنائے جا

کاہن مُرلی والے نند کے لال

بنسری بجائے جا

بنسری بجائے جا

کاہن مُرلی والے نند کے لال

بنسری بجائے جا

بنسری بجائے جا

بنسری کی لَے نہیں ہے آگ ہے

اور کوئی شے نہیں ہے آگ ہے

پریم کی یہ آگ چار سُو لگائے جا

جلائے جا جلائے جا

کاہن مُرلی والے نند کے لال

بنسری بجائے جا

بنسری بجائے جا

دل ہے پرائے بس میں

پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

سب جاگا ہے سویرا دُور ہُوا دنیا کا اندھیرا

لیکن گھر تاریک ہے میرا

چھم چھم ہیں جاگی ہیں گھٹائیں پھرتی ہیں سرمست ہوائیں

جاگ اُٹھو مے خانے والو پینے اور پلانے والو

زہر ملاؤ رس میں

دل ہے پرائے بس میں

(۴)

پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

باغ میں بلبل بول رہی ہے　　نرگس آنکھیں کھول رہی ہے

شبنم موتی رول رہی ہے

آہ پہ کوئل کوک اٹھی ہے　　سینے میں اک ہوک اٹھی ہے

بن جیاؤں نہ کہیں سودائی　　جانوروں کی رام دہائی

چبھتی ہے نس نس میں

دل ہے پرائے بس میں

(۳)

پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

بیت گیا دن رات بھی آئی تاروں نے محفل بھی سجائی

اُس نے مگر صورت نہ دکھائی

وہم کئی ٹالے ہیں میں نے تارے گن ڈالے ہیں میں نے

وعدے کا تو کس کو یقیں ہے آنکھ میں لیکن نیند نہیں ہے

نیند نے کھا لیں قسمیں

دل ہے پرائے بس میں

(۴)

پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

کیوں کرتے ہو دنیا داری جان گیا اُلفت میں تمہاری

تَرک کرو یہ نصیحت ساری

مُجھ کو تُم سے کام ہی کیا ہے؟ میرا ننگ و نام ہی کیا ہے؟

اِس دُنیا کی پریت یہی ہے رسم یہی ہے ریت یہی ہے

ٹُوٹ گئیں سب رسمیں

دل ہے پرائے بس میں

(۵)

پرائے بس میں

دِل ہے پرائے بس میں

کون بتائے اُلفت کیا ہے　　دل کیا دل کی حقیقت کیا ہے

مر مٹنے میں لذت کیا ہے

بے درد اس کو کیا پہچانے　　جس پر بیتی ہو وہ جانے

یہ سانسیں ہیں آنی جانی　　ہائے محبت، ہائے جوانی

آگ لگی ہے خس میں

دِل ہے پرائے بس میں

(۶)

پرائے بس میں

دِل ہے پرائے بس میں

دوست اِس کا نام نہ پوچھو   کچھ بھی نہیں ہے نام نہ پوچھو
مجھ سے کوئی پیغام نہ پوچھو
میرا بھی تم نام نہ لینا   مِل جائے تو یوں ہی کہہ دینا
اِک دیوانہ چُپ رہتا ہے   کہتا ہے تو یہ کہتا ہے

دل ہے پرائے بس میں
دل ہے پرائے بس میں

پرانی بسنت!

رنگ دے ـــــ رنگ دے قدیم رنگ

رنگ دے قدیم رنگ   بے دریغ ، بے درنگ
جس کی ضَو سے مات ہو   رنگِ بازئ فرنگ
عشق کے لباس کو
رنگ شوخ و شنگ دے

رنگ دے ـــــ رنگ دے قدیم رنگ

رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ

ایک ہی اُمنگ دے ایک ہی ترنگ دے

دین، دھرم مٹ نہ جائے پاس نام و ننگ دے

دامن دراز دے

یا قبائے تنگ دے

رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ

رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ

عمر گھٹ گئی تو کیا؟ ڈور کٹ گئی تو کیا

یہ ہوائے تند و تیز رُخ پلٹ گئی تو کیا

آ گئی بسنت رُت

اور اک پتنگ دے

رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ

رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ

صلح ہو کہ جنگ ہو ساتھیوں کا سنگ ہو

سب ہمیں پسند ہے خُون ہو کہ رنگ ہو

خُون ہو کہ رنگ ہو

ایک رنگ آنگ دے

رنگ دے — رنگ دے قدیم رنگ

پریت کا گیت

اپنے من میں پریت

بسا لے

اپنے من میں پریت

من مندر میں پریت بسا لے — او مورکھ او بھولے بھالے

دل کی دنیا روشن کر لے — اپنے گھر میں جوت جگا لے

پریت ہے تیری ریت پرانی — بھول گیا او بھارت والے

بھول گیا او بھارت والے

پریت ہے تیری ریت

بسا لے

اپنے من میں ریت

(۴)

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

کرودھ کپٹ کا اُترا ڈیرا ۔۔۔ چھایا چاروں کُونٹ اندھیرا

شیخ برہمن دونوں رہزن ۔۔۔ ایک سے بڑھ کر ایک لٹیرا

ظاہرداروں کی سنگت میں ۔۔۔ کوئی نہیں ہے سنگی تیرا

کوئی نہیں ہے سنگی تیرا

من ہے تیرا میت

بسالے

اپنے من میں پریت

(۱۴)

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

بھارت ماتا ہے دُکھیاری دُکھیارے ہیں سب نرناری

تُو ہی اُٹھالے سُندر مُرلی تُو ہی بن جا شام مُراری

تُو جاگے تو دُنیا جاگے جاگ اُٹھیں سب پریم پُجاری

جاگ اُٹھیں سب پریم پُجاری

گائیں تیرے گیت

بسالے

اپنے من میں پریت

(۴)

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

نفرت اِک آزار ہے پیارے دُکھ کا دارُو پیار ہے پیارے
آجا اپنے رُوپ میں آجا تُو ہی پریم اَوتار ہے پیارے
یہ ہارا تو سب کچھ ہارا مَن کے ہارے ہار ہے پیارے

مَن کے ہارے ہار ہے پیارے
مَن کے جیتے جیت

بسالے
اپنے من میں پریت

(۵)

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے سر جائے پر میت نہ جائے

مَیں ڈرتا ہوں کوئی تیری جیتی بازی جیت نہ جائے

جو کرنا ہو جلدی کرلے تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

وقت نہ جائے بیت

بسالے

اپنے مَن میں پریت

سپنا

دیکھ اس دُنیا کا نظارا

میرے ساز کے تاروں میں — رنگیں نغمہ زاروں میں
نیندوں کے دریاؤں میں ہے ایک حبابی دُنیا — اُس دُنیا کو دُنیا کہہ دیتی ہے خوابی دُنیا

دیکھ اس دُنیا کا نظارا

ہلکا ہلکا پیارا پیارا

میرے ساز کے تاروں میں — رنگیں نغمہ زاروں میں

ہستی کیا ہے میٹھا سپنا

سپنا کیا ہے میٹھی پریت میٹھی پریت ہے میرا گیت

میرے میٹھے گیتوں میں بستی ہے ساری مستی ساری ہستی گیت ہیں میرے نیند ہے میری بستی

ہستی کیا ہے میٹھا سپنا

دل میں رہنا آنکھ سے چھپنا

سپنا کیا ہے میٹھی پریت میٹھی پریت ہے میرا گیت

اُلفت کا اظہار

میرے دل کا باغ

پیاری، میرے دِل کا باغ

مَیں ہُوں دل کے باغ کا مالی لایا ہُوں پھُولوں کی ڈالی

نازک نازک پھُول ہیں جیسے اُجلے اور بے داغ ایسا ہی بے داغ ہے پیاری میرے دل کا باغ

پیاری، میرے دل کا باغ

مَیں ہُوں دل کے باغ کا مالی لایا ہُوں پھُولوں کی ڈالی

اُلفت کا احساس

پیاری، اُلفت کا احساس

اُلفت ہے پھولوں کا گہنا　　خوشبوؤں میں رہنا سہنا

مدّھم مدّھم، بھینی بھینی، ان پھولوں کی باس　　میٹھا میٹھا درد ہو جیسے اُلفت کا احساس

پیاری، اُلفت کا احساس

اُلفت ہے پھولوں کا گہنا　　خوشبوؤں میں رہنا سہنا

اُلفت کا اظہار

پیاری، اُلفت کا اظہار

میری ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں　　تیری یہ حیران نگاہیں

اِن پھولوں کی ہر ڈالی ہے اِک گلشن بے خار　　اِن پھولوں کی رنگت جیسے اُلفت کا اظہار

پیاری، اُلفت کا اظہار

میری ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں　　تیری یہ حیران نگاہیں

اندھی جوالی

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

گھٹائیں کالی کالی

خوب برسنے والی

متوالی

پرشور

گھٹائیں

چھائی ہیں گھنگھور

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

گُلشن کی گُل پوش ادائیں   اُموں کی خاموش فضائیں

کوئل کی مدہوش صدائیں

بَن میں بول رہے ہیں مور

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور   گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

○

جوانی لے آئی برسات   جوانی لے آئی برسات

جوانی، ہائے جوانی

سرشوری، نادانی

مستانی

بد ذات

جوانی

لے آئی برسات

جوانی لے آئی برسات

بیٹھا ہوں راوی کے کنارے کرتا ہوں پریوں کے نظارے

آہ نگاہیں، آہ اشارے

چھائی نظر پہ کالی رات

جوانی لے آئی برسات جوانی لے آئی برسات

○

محبت آہوں کا طوفان محبت آہوں کا طوفان

محبت، پیاری پیاری

میٹھی سی بیماری

بے چاری

انجان

محبت

آہوں کا طوفان

محبت آہوں کا طوفان

اِک کشتی ملّاح سے خالی میں نے اُٹھا طوفان میں ڈالی
اس کشتی کا اللہ والی

لے چل لے چل اَے طوفان

محبت آہوں کا طوفان محبت آہوں کا طوفان

حُسن اور موت

ذِلّتوں سے تنگ آ کر عشق آخر مر گیا
ہاؤ ہو کو لے گیا میدان خالی کر گیا
مر گیا ——— عشق آخر مر گیا
اُٹھ گئی آہ و فغاں
رہ گئے کچھ استخواں

بے بسی
بے کسی

نوحہ خواں ——— زندگی پر نوحہ خواں
مر گیا ——— عشق آخر مر گیا
ذِلّتوں سے تنگ آ کر عشق آخر مر گیا

موت نے چاہا کہ تکمیلِ جہاں بانی کرے

آج شاہِ حسن کو وقفِ پشیمانی کرے

دیکھ لے ——— حسن آکر دیکھ لے

زندگانی کا مآل

اس جوانی کا مآل

عیش کو

طیش کو

پامال ——— لن ترانی کا مآل

حسن آکر دیکھ لے

موت نے چاہا کہ تکمیلِ جہاں بانی کرے

آ رہا تھا حُسن بھی اٹھکیلیاں کرتا ہُوا

آپ ہی اپنی ہوا خواہی کا دم بھرتا ہُوا

بے حجاب ——— شوخیاں کرتا ہُوا

بیش و کم سے بے خبر

زیر و بم سے بے خبر

شاد شاد

بامُراد

بے خبر ——— رنج و غم سے بے خبر

بے حجاب ——— شوخیاں کرتا ہُوا

آ رہا تھا حُسن بھی اٹھکیلیاں کرتا ہُوا

یہ تماشا دیکھ کر موجِ صبا چُپ ہو گئی
شاخِ گُل پر بُلبلِ رنگیں نوا چُپ ہو گئی

ہو گئی ——— ہر صدا چُپ ہو گئی

اور فضا گھبرا گئی

خوف سے تھرّا گئی

ہوش پر

جوش پر

چھا گئی ——— مُردنی سی چھا گئی

ہو گئی ——— ہر صدا چُپ ہو گئی

یہ تماشا دیکھ کر موجِ صبا چُپ ہو گئی

آج حُسن و موت میں اِک معرکہ ہونے کو تھا
کون رہ جائے گا باقی، فیصلہ ہونے کو تھا

فیصلہ! ——— جانے کیا ہونے کو تھا

دم بخود تھی کائنات
اُڑ گیا رنگِ حیات
تھم گئے
جم گئے

بے ثبات ——— سب وجود بے ثبات

فیصلہ! ——— جانے کیا ہونے کو تھا

آج حُسن و موت میں اِک معرکہ ہونے کو تھا

حُسن آیا سر خوشِ کیفِ شرابِ زندگی
موت کی وادی پہ چمکا آفتابِ زندگی
زندگی ——— کامیابِ زندگی

ابتدا سے بے نیاز
ماسِوا سے بے نیاز

سر بسر
بے خبر

بے نیاز ——— انتہا سے بے نیاز
زندگی ——— کامیابِ زندگی
حُسن آیا سر خوشِ کیفِ شرابِ زندگی

استخوانوں پر پڑی جب چشمِ بے پروائے حسن

خندۂ دلچسپ تھا اندازِ استہزائے حسن

اور بھی مٹ گئے اعدائے حسن

موت حیراں ہو گئی

خود پشیماں ہو گئی

زندگی

خوش ہوئی

ہو گئی بلکہ خنداں ہو گئی

اور بھی مٹ گئے اعدائے حسن

استخوانوں پر پڑی جب چشمِ بے پروائے حسن

عشق کے مرنے میں بھی اک آن پیدا ہو گئی
یعنی مُردہ ہڈّیوں میں جان پیدا ہو گئی
ہو گئی ——— شان پیدا ہو گئی

شوخیٔ انداز تھی
یا نگاہِ ناز بھی
اُف نگاہ
بے پناہ

راز تھی ——— واقعی اِک راز تھی
ہو گئی ——— شان پیدا ہو گئی
عشق کے مرنے میں بھی اک آن پیدا ہو گئی

کاہل کا گیت

(امریکن شاعرہ ایلا وھیلر ولکاکس کی ایک نظم سے)

اب شام ہو چلی ہے		اب چھا چلا اندھیرا
دُنیا پہ آسماں نے		صبر و سکوں بکھیرا

اور دامنِ شفق پر
سُرخی نے رنگ پھیرا

مستور ہیں ہوائیں		اس پُر سکوں فضا میں
کچھ میٹھے میٹھے نغمے
کچھ گیت کچھ ترانے

لیکن اُداس ہوں میں		بالکل اُداس ہوں میں

بے کار ہی گزارا یہ دن پھر آج میں نے

سوچا نہ کاہلی کا کوئی علاج میں نے

اُٹھ کر نہیں سنوارا

کچھ کام کاج میں نے

کھیتوں میں جانے والے ہمت دکھانے والے

لوٹے ہیں کام کر کے

دامن خوشی سے بھر کے

خوشیاں منا رہے ہیں اور گیت گا رہے ہیں

○

خوش ہو کے اس طرح سے گاتی نہیں کبھی میں

اس خوشنما خوشی کو پاتی نہیں کبھی میں

اس کیف و سرخوشی میں

آتی نہیں کبھی میں

میری اُداس گھڑیاں   رہتی ہیں سینہ کوباں
سُن سُن کے یہ مُنادی
اب ہو چُکی ہوں عادی
چُپ چاپ سُن رہی ہوں   اور سر کو دُھن رہی ہوں

○

مغرب کے سُرخ بادل   مرجھا چکے ہیں سارے
اور شام کی جبیں پر   چھلکے ہوئے ہیں تارے
لیکن میں سرنگوں ہوں
بیٹھی ہوں اِک کنارے

بے تاب ہو رہی ہوں   چُپ چاپ رو رہی ہوں
بے کار زندگی پر
بیمار زندگی پر
سر کو کھپا رہی ہوں   آنسو بہا رہی ہوں

لیکن ہے مدتوں سے ایسا ہی حال میرا
سب بھول جاؤں گی میں آئے گا جب سویرا

پھر کالی گھٹا آ کر
دل میں سجے گا ڈیرا

دن بیت جائے گا پھر یہ وقت آئے گا پھر
خوش ہونگے کام والے
اور میں کروں گی نالے
تدبیر سے ڈروں گی تقدیر پر مروں گی

O

جب صبح کی ضیا میں ملتی نہیں مسرت
پھر شام کی ردا میں حاصل ہو کیا فراغت
مجھ کو تو ایک پل بھی
ہوتی نہیں یہ جرأت

دل کو ذرا سنبھالوں پھولوں پہ آنکھ ڈالوں

دل ہے مرا فسردہ

شاید ہوں وہ بھی مُردہ

شاید وہ میرے پیارے مُرجھا چکے ہوں سارے

○

یہ دن یہ میری راتیں یہ ماہ سال سارے

بڑھتے رہے ہمیشہ رنج و ملال میرے

ہاں خوشنما بہت ہیں

خواب و خیال میرے

لیکن انہیں اگر میں تحفے کے طور پر میں

اُس در پہ لے کے جاؤں

دربار میں دکھاؤں

تو وہ جہاں کا آقا مجھ کو نکال دے گا

آقا کے سامنے کیا مُنہ لے کے جاؤں گی مَیں
خواب و خیال کیوں کر جا کر دکھاؤں گی مَیں

شرمندہ ہو کے یُونہی
بس لَوٹ آؤں گی مَیں

غفلت شعار ہُوں مَیں تقصیر وار ہُوں مَیں
اُس نے اگر یہ پُوچھا
دُنیا سے لائی ہے کیا

پھر کیا جواب دُونگی اللہ میں کیا کہوں گی

راحت پسند ہستی کچھ کام کاج کرلے
اِن محنتوں کا خوگر اپنا مزاج کرلے
جو کام کل کرے گی
وہ آج کرلے

اُٹھ کارگاہ میں چل محنت کی راہ میں چل

اُٹھ وقت جا رہا ہے

تجھکو بتا رہا ہے

تُو عمر کھو رہی ہے برباد ہو رہی ہے

چلی ہے جان یادِ رفتگاں میں
مسافر ہے تلاشِ کارواں میں

والدہ کی موت

(۱۹۲۵ء میں جب مصنف خیرپور سندھ میں تھا)

اے کہ جینا تھا تجھے بھی ناگوار
اے کہ تو مدت سے تھی زار و نزار

مل گئی مٹی میں تو پایانِ کار
بن گیا ہے آج تیرا بھی مزار

فکر تھی تجھ کو بہت اولاد کی
راہ لی آخر عدم آباد کی

موجہائے اشک میں بہتی رہی
رنگاں کی یاد میں رہتی رہی

دائمی ماتم کے دکھ سہتی رہی
جلد مر جاؤں گی یہ کہتی رہی

آج فرصت ہو گئی ہر کام سے
سو رہی لحد میں سو بڑے آرام سے

میری اولادوں کے تھے ارماں تجھے   اب پڑھانا تھا اُنہیں قرآں تجھے
یُوں نہ کرنا تھا اُنہیں حیراں تجھے   بچیاں روتی ہیں اے اماں تجھے

آج کیوں اِن سے جُدا سوتی ہے تُو؟
دامنِ مادر میں جا سوتی ہے تُو؟

تُو نے کیں میری بہت غمخواریاں   عمر بھر کرتی رہی دلداریاں
ہائے رے مجبوریاں لاچاریاں   مجھ کو دھوکا دے گئیں ناداریاں

وقتِ آخر مَیں نہیں تجھ سے قریب
وقتِ آخر رہ گیا مَیں بدنصیب

اللہ اللہ کس قدر مجبور ہوں   زر نہیں آنے سے بھی معذور ہوں
کیا کہوں اس وقت بے مقدور ہوں   آہ تجھ سے کالے کوسوں دُور ہوں

تُو نے بھیجا تھا مجھے پردیس میں
تاکہ آؤں رزق لے کر دیس میں

آہ وہ حسرت دمِ رخصت تری! وہ تبسم میں نہاں رقت تری!

آہ وہ معصوم سی صورت تری! آہ وہ مغموم سی شفقت تری!

وہ نگہ پر بے کسی چھائی ہوئی

وہ تری آواز بھرائی ہوئی

میرے سر پر ہاتھ رکھنا پیار سے اور یہ کہنا بڑے اصرار سے

اے پسر بے بس کر رہ گھر بار سے کام کیا تجھ کو مرے افکار سے

تُو نہ رو اچھی ہوئی جاتی ہوں میں

غم نہیں کھاتی دوا کھاتی ہوں میں

ہائے آنے میں تذبذب تھا تجھے ہائے آنا ہی نہ تھا زیبا تجھے

خود ہی تُو نے دودھ جب بخشا مجھے روکتا تھا میرا اندیشہ تجھے

کر دیا بے بس تری تاکید نے

سا تھ ہی والد کی بھی تائید نے

مَیں نے تیرے پاؤں پر بوسہ دیا　　تُو نے سینے سے مجھے چمٹا لیا
کانپتے لب نے امان اللہ کہا　　اور مُنہ سر چُوم کر رخصت کیا

راستے سے لَوٹ آیا میں مگر
کیونکہ تھی تیری نقاہت پُر خطر

پھر بُرائی کی میری تقدیر نے　　دی دغا کوتاہیٔ تدبیر نے
کر دیا قائل تری تقدیر نے　　اور کھینچا رزق کی زنجیر نے

حُکم سے تیرے ہُوا لاچار مَیں
پھر سفر پر ہو گیا تیار مَیں

گھر سے مَیں نکلا اُدھر گھر لُٹ گیا　　مَیں تلاشِ زر میں تھا زر لُٹ گیا
لُٹ گیا بختِ سکندر لُٹ گیا　　گلشنِ آغوشِ مادر لُٹ گیا

مَیں شکستہ پر چمن سے دُور ہُوں
دُور ہُوں خاکِ وطن سے دُور ہُوں

آج میں ہوں اور تنہائی مری　　ہم نفس ہے خاکِ صحرائی مری

دم بخود ہے نا شکیبائی مری　　دل کی دنیا ہے تماشائی مری

دل ہی میں بیتاب ہو لیتا ہوں میں

اور چپکے چپکے رو لیتا ہوں میں

تیری خدمت کیلئے زندہ تھا میں　　تیری راحت کیلئے زندہ تھا میں

اِس سعادت کیلئے زندہ تھا میں　　اِس ضرورت کیلئے زندہ تھا میں

ہو سکی افسوس یہ خدمت تری

مجھ سے مستغنی رہی مِنّت تری

اب کرے گا کون میرا انتظار　　خط لکھے گا کون مجھ کو بار بار

کون اب لے گا بلائیں بے شمار　　کون میرے دُکھ سے ہو گا بے قرار

اب حقیقی مادری شفقت کہاں

بے غرض بے مدّعا اُلفت کہاں

قطع کرنی پڑ گئی راہِ بعید — تاکہ جنّت میں ہو تیری باز دید

اے خدائے پاک اے ربِّ مجید — "منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید

نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے"

مَوت کو بھی اک زمانہ چاہیئے

بھائیوں کے غم ستاتے ہیں مجھے — مرنے والے یاد آتے ہیں مجھے

لوگ کیوں نغمے سناتے ہیں مجھے — میں نہیں روتا رُلاتے ہیں مجھے

کیا خبر ان کو مرا کیا حال ہے

میری ہستی کس قدر پامال ہے

غروبِ آفتابِ سخن

(اپنے اُستاد حضرت مولانا گرامی قدس سرّہٗ کی وفات پر)

صبح کے ساحل سے جو کشتی چلی تھی نُور کی
آخر کار اُس نے طے کر لی مسافت دُور کی

شکر ہے دریائے ہستی کا کنارا مل گیا
بے سہارا حسرتوں کو اِک سہارا مل گیا

اِس مسافر کے لئے منزل ہے ساحل شام کا
کٹ گیا لمبا سفر وقت آگیا آرام کا

آرزو نے پاؤں پھیلائے ہیں سونے کے لئے
ولولے بیتاب ہیں آسودہ ہونے کے لئے

اب یہ محشر خواب کے طوفان میں کھو جائے گا
نیند آجائے گی چُپ ہو جائے گا سو جائے گا

شام نے کچھ اس طرح پھیلا دیا ہے دامِ خواب
موت کی تاریکیوں میں گھر گیا ہے آفتاب

اس غمِ جانکاہ میں چشمِ شفق خونبار ہے
بادلوں کا اِک جلوسِ ماتمی تیار ہے

نُور کے شُعلے کہ یہ کالا کفن پہنائیں گے
پھر اُٹھا کر پردۂ ظُلمات میں لے جائیں گے

بزمِ ہستی کا چراغِ حُسن گُل ہو جائے گا
روزِ روشن رات کے آغوش میں سو جائے گا

یاس ہی کے دل میں رہتی ہے مگر اُمید بھی — شام ہوتی ہے ہمیشہ صبح کی تمہید بھی

لیکن اے بختِ سیہ یہ شام ہے شامِ فراق — اس کے دامن میں نظر آتے ہیں ایّامِ فراق

چھُپ رہا ہے اس کے پردے میں اک ایسا آفتاب — پھر طلوعِ صبحِ محشر تک نہیں جس کا جواب

اپنے بدقسمت ستاروں کو بُلا لے آسماں — سوچتا کیا ہے صفِ ماتم بچھا لے آسماں

جا رہا ہے بختِ روشن پھر نہ واپس آئے گا — کون دُنیا میں ترے اقبال کو چمکائے گا

بے زباں تاروں کی عشرت کیا ہے بزمِ خواب ہے — یہ چمک کچھ بھی نہیں ہے آنسوؤں کی آب ہے

آہ وہ خرمن جہاں سے جھولیاں بھرتے تھے یہ — جس شعاعِ نور سے کسبِ ضیا کرتے تھے یہ

آج وہ خورشیدِ عالمتاب خود گہنا گیا — چشمۂ آبِ بقا تاریکیوں میں آ گیا

مادرِ گیتی سیہ پوشی کی تیاری کرے — میّتِ فرزند پہ ماتم کرے زاری کرے

اے عروسِ زندگانی لُٹ گیا تیرا سہاگ — سرد کر ڈالی قضا نے سینۂ اُلفت کی آگ

اے دُلہن زیور بڑھائے اوڑھ لے چادر سیاہ — ہمکنارِ مرگ ہے تیرا شہِ خاور سیاہ

پتلیوں میں آ بسی جانِ جگر آج ہی دیکھ لے — پھر نہ دیکھے گی کبھی شانِ جگر آج ہی دیکھ لے

ہے لباسِ شعر خونِ آرزو سے لالہ زار
قبر ہے رنگینیوں کی یا گراں جی کا مزار

اُٹھ گیا دن کا تحمل، رات آگئی، خاموش رات
اُف بھیانک رات، اندھی رات، ماتم پوش رات

اے نگاہِ حسن جا اپنے سیہ خانے میں بیٹھ
سرنگوں پلکیں جھکا لے بند کاشانے میں بیٹھ

اُڑ گیا اے حسن تصویرِ وفاداری کا رنگ
عشق کے جذبات میں آیا ہوس کاری کا رنگ

ہر طرف تاریکیاں چھائیں اُجالا چھپ گیا
تیری عصمت کی گواہی دینے والا چھپ گیا

اے جنونِ عشق داماں و گریباں چاک کر
اپنے ہاتھوں اپنی ہستی کو سپردِ خاک کر

اب تری تصویرِ وحشت پیکرِ بے رنگ ہے
مٹ گئی دنیائے دل میدانِ ہستی تنگ ہے

اب تمارش چاہتا ہے دیدۂ نظارہ بیں
اب کسے آئے گا تیری پاکبازی کا یقیں

اے زبانِ شوق تیری شعلہ گفتاری گئی
اے متاعِ ذوق تیری گرم بازاری گئی

دن ڈھلے ہی بلبلِ باغِ سخن کے ہم صفیر
ہو چکے ہیں اپنے اپنے آشیانوں میں اسیر

اب یہاں موجِ شمیمِ جاں فزا آئے تو کیوں
نالۂ جانکاہِ بلبل کی صدا آئے تو کیوں

اب گلستانِ سخن اُجڑا ہوا ویرانہ ہے — سرد ہے دل، بے زباں آہوں کا ماتم خانہ ہے

اب صبا آتی ہے تھرّاتی ہوئی ڈرتی ہوئی
رنگ کی بے مائگی پر سسکیاں بھرتی ہوئی

اے تکلم چپ نہ ہو اِک آخری فریاد کر — قبر کی خاموش دُنیائے سخن ایجاد کر
ہو گئے خاموش ہنگامے تری آواز کے — اب نہ چھیڑے گا مغنّی تار تیرے ساز کے
سو گئے ملہی پسند شور انگیز افسانے ترے — اُٹھ گیا پیرِ مغاں خالی ہیں پیمانے ترے
اب تخیّل میں بھرے گا زندگی کے رنگ کون — شُعلہ بن کر آپ ہو جائے گا زیبِ سنگ کون
بن گئی رنگینیٔ گفتار تصویرِ خموش — گوشۂ فردوس میں پنہاں ہوا فردوسِ گوش

رہ گیا رنگِ سخن اُترے ہوئے پھولوں کی باس
کون پہنائے گا اب صورت کو معنی کا لباس

ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملّاح

(مولانا محمد علی قدس سرّہٗ کی وفات پر)

"شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل" نہنگانِ اجل کی تیغیں بیداد پر مائل

غضب تھا اِک شکستہ ناؤ کا منجدھار میں پھنسنا وفا کی سسکیاں، قسمت کا رونا، موت کا ہنسنا

فقط اِک "سرپھرا" ملّاح طوفانوں سے لڑتا تھا ہوا کے آب کے جنّوں سے شیطانوں سے لڑتا تھا

اگرچہ ناؤ میں انبوہ در انبوہ انساں تھے یہ سب ملّاح کے ہم قوم تھے پکّے مسلماں تھے

یہ سب تھے عقل و جرأت میں ارسطو اور اسکندر مگر آرام سے لیٹے ہوئے تھے ناؤ کے اندر

چلی جاتی تھی کشتی خشمگیں موجوں سے ٹکراتی اُبھرتی، بیٹھتی، دبتی، دباتی اور چکراتی

کہیں گرداب کے منہ میں کہیں پُرشور دھارے پر کبھی اس کے اشارے پر کبھی اس کے اشارے پر

ہوا کے دوش پر خونخوار عفریتوں کی فوجیں تھیں پہاڑ اُٹھ اُٹھ کے ٹکراتے تھے یا پانی کی موجیں تھیں

فلک پر بے تحاشا دوڑتے تھے ابر کے گھوڑے
کڑکتی بجلیاں برسا رہی تھیں آتشیں کوڑے

اُڑا کرتے ہیں صدموں سے جگر کے جس طرح لختے
اکھڑتے جا رہے تھے رفتہ رفتہ ناؤ کے تختے

تعجب ہے کوئی پروا نہیں تھی ناؤ والوں کو
کہ طوفاں میں نظر آتی تھی "خامی" باکمالوں کو

انہیں معلوم تھا گرداب نے کشتی کو گھیرا ہے
گھڑی بھر میں یہ بیڑا اب نہ تیرا ہے نہ میرا ہے

انہیں دعوے تھے بحرِ زندگی میں ناخدائی کے
انہیں گر یاد تھے گرداب میں مشکل کشائی کے

یہ طوفانوں پہ کر سکتے تھے پیچیدار تقریریں
دکھا سکتے تھے تقریروں میں طوفانوں کی تصویریں

ہوا کا رُخ ذرا بدلے تو سب کچھ جان جاتے تھے
تہِ دریا نہنگوں کی نظر پہچان جاتے تھے

یہ سب جو پاؤں پھیلائے ہوئے کشتی میں لیٹے تھے
پرانے ناخداؤں اور ملاحوں کے بیٹے تھے

مگر وہ "سرپھرا ملاح" تنہا تھا، اکیلا تھا
اِدھر موجوں کی شدت تھی، اُدھر پانی کا ریلا تھا

وہ چلاتا تھا، اٹھو بھائیو! آؤ، اِدھر آؤ
ذرا ہمت دکھاؤ دست و بازو کام میں لاؤ

ہوائیں اُڑ چکی ہیں دھجی دھجی بادبانوں کی
شکستہ ہو چکی ہے ناؤ، مانگو خیر جانوں کی

اُکھڑ جائیں گے تختے، آؤ اِن کو تھام لو آکر
سلامت ہیں جو کچھ "اوزار" اُن سے کام لو آکر

اِدھر سیلاب پھر آتا ہُوا معلوم ہوتا ہے
اِدھر گرداب بل کھاتا ہُوا معلوم ہوتا ہے

نہیں ہنگام سونے کا کھڑے ہو جاؤ تن جاؤ
حوادث کے مقابل آہنی دیوار بن جاؤ

مبادا ناؤ اب کے اور بھی کمزور ہو جائے
یہ گرداب بلا شاید دہانِ گور ہو جائے

وہ چلّایا وہ چیخا منّتیں کیں آہ و زاری کی
مگر بے سُود تھا سب کچھ کسی نے بھی نہ یاری کی

نہ آمادہ ہُوا کوئی بھی جرأت آزمائی پر
سبھی ہنستے رہے ملّاح کی "ہرزہ سرائی" پر

بلاتا تھا وہ نامِ غیرتِ اسلام لے لے کر
جھڑک دیتے تھے لیکن سب اُسے دُشنام دے دے کر

مگر ملّاح اپنے فرض کا احساس رکھتا تھا
وہ اپنے ساتھیوں کی آبرو کا پاس رکھتا تھا

اُسی نے جسم پر کھائے تھپیڑے تند موجوں کے
اُسی کے ساتھ ٹکرائے ہوائے تیز کے جھونکے

وہ اپنی جان پر سہتا رہا، سہتا رہا تنہا
اُٹھو! ہمت کرو! کہتا رہا کہتا رہا تنہا

مگر ہنستے رہے، ہنستے رہے غفلت کے شیدائی
: اسی کشتی کے ہمراہی اسی ملّاح کے بھائی

اُدھر بڑھتی رہی، بڑھتی رہی دریا کی طغیانی
اِدھر گھٹتی رہی گھٹتی رہی توفیقِ انسانی

شکستہ ناؤ کا ملّاح بے دم ہو گیا آخر
بڑھا کر حوصلہ تن میں لہو کم ہو گیا آخر

گرا دریا میں چپّو، ہاتھ سے پتوار بھی چھوٹی
شکستہ ہو گئے بازو مگر ہمّت نہیں ٹوٹی

وہ کشتی کے محافظ ڈھونڈتا تھا اب بھی ہاتھوں میں
انہیں تاکید کرتا تھا اشاروں ہی اشاروں میں

مگر اُس کے اشاروں کو سمجھ سکتا نہ تھا کوئی
سمجھ سکتا بھی ہو، تو اس طرف تکتا نہ تھا کوئی

تھکن کا ہو رہا تھا اب اثر آہستہ آہستہ
لگا جُھکنے وہ سرافراز سر، آہستہ آہستہ

وہی سر جو ہواؤں سے نہ طوفانوں سے جھکتا تھا
نہ فرعونوں سے جُھکتا تھا نہ ہامانوں سے جُھکتا تھا

نہ جُھکتا تھا کبھی میر و وزیر و شاہ کے آگے
وہ سر، اک مرتبہ پھر جُھک گیا اللہ کے آگے

تعجب سے ردائے ابر میں سے برق نے جھانکا
کہ یہ اِک آخری سجدہ تھا اُس مردِ مسلماں کا

شکستہ ناؤ میں طوفان کی اس چیرہ دستی میں
وہ اپنا فرض پُورا کر چکا تھا بحرِ ہستی میں

نہ رو، او بے حمیت قوم! اب رونے سے کیا حاصل
دکھانے کے نہیں قابل یہ منہ دھونے سے کیا حاصل

ترا رونا تری طرزِ ستم سے بھی نرالا ہے
اُسے روتی ہے جس کو تُو نے خود ہی مار ڈالا ہے

درِ توبہ بغیرِ توبہ ہرگز کھل نہیں سکتا
لہو کا داغ رسمی آنسوؤں سے دُھل نہیں سکتا

ننھّی اصغری

(ایک بچّی کی موت پر)

دُنیا میں آگیا تھا رحمت کا اِک فرشتہ
ہم خاکیوں سے آکر جوڑا تھا اُس نے رشتہ

اُلفت کا بیج بو کر فردوس کو سدھارا
اللہ کی رضا پر کیا زور ہے ہمارا

ننھّی سی ایک چڑیا جنّت سے آگئی تھی
آنکھوں میں بس گئی تھی دل میں سما گئی تھی

من موہنی سی مینا — کچھ روز چہچہائی
لیکن ہوا یہاں کی — اُس کو نہ راس آئی

○

آخر اُداس ہو کر — چپ چاپ اُڑ گئی وہ
جنّت سے آئی تھی وہ — جنّت کو مُڑ گئی وہ

○

لوٹے گی اب نہ ہرگز — ہم لاکھ اُسے بلائیں
چاہے ہزار پیٹیں — رو رو کے سر کھپائیں

○

اب کیا بتا سکے گا — رو رو کے جان کھونا
رونے سے فائدہ کیا؟ — بے فائدہ ہے رونا

○

ہاں یاد آ رہی ہیں — اس کی وہ ساری باتیں
وہ بھولی بھولی صورت — وہ پیاری پیاری باتیں

وہ ہم سِنوں سے مل کر بے اختیار ہنسنا
وہ بار بار باتیں وہ بار بار ہنسنا

○

ہوتا نہ تھا کسی سے جھگڑا فساد اس کو
اور "شاندار گنگا" ساری تھی یاد اس کو

○

نظمِ حفیظ پڑھنا ہر ایک کو سُنانا
"میرا سلام لے جا" میٹھے سُروں میں گانا

○

اِک پاک رُوح تھی یا معصوم اصغری تھی
سچ مچ وہ نیک بچّی جنّت کی تیتری تھی

○

نیند آگئی ہے اس کو پھُولوں میں سو گئی ہے
تصویر کی طرح سے خاموش ہو گئی ہے

تم چاہتے ہو اسلم　　رو کر اسے جگانا
گویا سمجھ رہے ہو　　اس نیند کو بہانا

○

سونے دو سو رہی ہے　　اب مت اسے جگاؤ
اس دُکھ بھرے جہاں میں　　واپس نہ پھر بلاؤ

○

دُنیا ہے سُکھ سے خالی　　دُکھ چار سُو بھرا ہے
غم کے سوا یہاں پہ　　سوچو تو کیا دھرا ہے

موت کا قافلہ

آتی ہے آوازِ درا
یہ قافلہ ہے موت کا
دیکھو وہ گرد اُڑاتی ہوئی
افلاک پر چڑھتی ہوئی
ہر موڑ پر مُڑتی ہوئی
ہر سمت کو بڑھتی ہوئی

آہوں کے ڈیرے ساتھ ہیں
گہرے اندھیرے ساتھ ہیں
حسرت بھری خاموشیاں
ہیں ساتھ ساتھ اسکے رُدال
یہ قافلہ ہے موت کا
آتی ہے آوازِ درا

ہاں موت ہے یہ موت ہے اپنا سفر کرتی ہے طے
یعنی دیارِ ہست کو پھرتی ہے سر کرتی ہوئی ہر اک بلند و پست کو
زیر و زبر کرتی ہوئی

کہسار کیا میدان کیا آباد کیا ویران کیا
یہ سب کو ٹھکراتی ہوئی زیرِ نگیں لاتی ہوئی
اپنا سفر کرتی ہے طے ہاں موت ہے، یہ موت ہے

پنجے درندوں کی طرح بازو پرندوں کی طرح
ہے ہڈیوں کے ڈھانچ پر افسردگی لپٹی ہوئی ڈائن کی صورت سر بسر
آزردگی لپٹی ہوئی

آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی مُردہ دلی چھائی ہوئی
پچکے ہوئے سے گال ہیں بکھرے ہوئے سے بال ہیں
بازو پرندوں کی طرح پنجے درندوں کی طرح

اس کی خوشی ماتم میں ہے — اس کی مسرت غم میں ہے
نالے نہیں یہ درد کے — اس دیوتی کا راگ ہے — جھونکے ہوائے سرد کے
اس کے نفس کی آگ ہے

جس شہر میں جلتی ہے یہ — جس راہ پر چلتی ہے یہ
آتی ہے آوازِ فغاں — اٹھتا ہے آہوں کا دھواں
اس کی مسرت غم میں ہے — اس کی خوشی ماتم میں ہے

اس کے جلوس میں رواں — گل پیرہن بانکے جواں
بوڑھے بھی ہیں بچے بھی ہیں — ہیں عورتیں بھی مرد بھی — گھوڑے بھی ہیں سچے بھی ہیں
احرار بھی دل سرد بھی

خاطی بھی ہیں معصوم بھی — مسرور بھی مغموم بھی
مجبور بھی مختار بھی — مفلوک بھی زردار بھی
گل پیرہن بانکے جواں — اسکے جلوس میں ہیں رواں

یاروں سے دل برداشتہ پیاروں سے دل برداشتہ

یہ پریم گھاتی موت کے موہ لوبھ تج کر آئے ہیں سارے براتی موت کے

پھولوں میں سج کر آئے ہیں

عاشق وفا بھولے ہوئے معشوق ادا بھولے ہوئے

بیوی کا دل توڑے ہوئے بچوں سے منہ موڑے ہوئے

پیاروں سے دل برداشتہ یاروں سے دل برداشتہ

کہتی ہے آوازِ جرس اللہ بس، باقی ہوس

سنتے ہیں سب شاہ و گدا یہ موت کی آواز ہے سب ہیں اسی کے ہم نوا

کتنا سُریلا ساز ہے

لاچار ہیں مجبور ہیں اس سحر میں مسحور ہیں

یہ نیند کے ماتے ہیں سب سوتے چلے جاتے ہیں سب

کہتی ہے آوازِ جرس اللہ بس باقی ہوس

یہ قافلہ ہے موت کا　　چلتا ہی چلتا جائے گا

اِس کے شہیدانِ اجل　　بڑھتے ہی بڑھتے جائینگے　　کوہِ ندا پر سر کے بل
چڑھتے ہی چڑھتے جائینگے

یہ سست رَو آتش قدم　　جائینگے تا ملکِ عدم

منزل مگر معدوم ہے　　اللہ کو معلوم ہے

چلتا ہی چلتا جائے گا　　یہ قافلہ ہے موت کا

ایک اور شامِ رنگیں

جہاں دھرتی کے سینے پر تھی مارا مار گھوڑوں کی
جہاں ٹاپیں سُموں کی تھیں جہاں جھنکار کوڑوں کی

جہاں برق و دُہل کا شور و غل تھا جھانجھ بجتے تھے
جہاں بجلی چمکتی تھی جہاں بادل گرجتے تھے

جہاں برچھوں کے پھل آتے ہی گر جاتے تھے سینوں میں
جہاں وزن کئے جاتے تھے ہستی کے سفینوں میں

مسلّط ہے فضاؤں پر وہاں اب دورِ مدہوشی
کجا ہنگامۂ محشر کجا عالم فراموشی

بالآخر شام کی منزل پہ روزِ ہولناک آیا
اقامت گاہ پر جنگی سپاہی سینہ چاک آیا

سکت باقی نہیں ہے خاک میں ہنگامہ کوشی کی
پڑی ہے زندگی اوڑھے ہوئے چادر خموشی کی

شفق ہے یا لہو کی گرمیوں نے گُل کھلائے ہیں
زمیں کے داغ اُبھرے ہیں فلک پر رنگ لائے ہیں

یہ ریگ و سنگ کی وادی گماں تھا جس پہ بنجر کا
پھلا پھولا ہے اس میں کھیت ہر سُو تیغ و خنجر کا

عجب مضموں نگیں ہیں یہ تختے سنگریزوں کے
ہیں سجدہ ریز ان پر سر قلم ہو ہو کے نیزوں کے

کہیں ناوک کہیں اُفتادہ ہیں ٹکڑے کمانوں کے
کہیں شمشیر کے قبضے کہیں ٹکڑے ہیں میانوں کے

کہیں اُلٹے پڑے ہیں نخچیروں کے بکھرے گیلے
کہیں مقتول گھوڑے تھوڑی تھوڑی ریت کے ٹیلے

کہیں تیر ہیں کہیں چھوٹے ہوئے مغفر ہیں اُفتادہ
کہیں ٹوٹی ہوئی ڈھالیں کوئی نقشیں کوئی سادہ

بقیہ ہے یہ انسانوں کے جوش و کبر و مستی کا
یہ منظر آخری ہے خود گری کا خود شکستی کا

عصائے پیری

گیا وہ ہنگامِ خود پرستی
اُجڑ چکی ولولوں کی بستی

خزاں کے ہاتھوں سے لُٹ چکی ہے ہوس کی شوخی ہوا کی مستی
شباب کی وادیٔ طرب سے گزر گیا کاروانِ ہستی

عدم کا پُرہول راستہ ہے اُدھر بلندی اِدھر ہے پستی
گیا وہ ہنگامِ خود پرستی

سفر ہے اور رات کا اندھیرا نہ جانے کب آئے گا سویرا
ٹھہر کے چلنا ہے غیر ممکن کہ عمر کا لد چکا ہے ڈیرا

گرہ میں زادِ سفر نہیں ہے ہے جان کی تاک میں لٹیرا

غرض پرستوں کی ہمرہی ہے　　نہ کوئی تیرا نہ کوئی میرا

سفر ہے اور رات کا اندھیرا

قدم قدم پر ہزار ٹھوکر　　نہ عشق ساتھی نہ عقل رہبر

سنبھل کے چلنا ہے سخت مشکل　　کہ پاؤں جمتے نہیں زمیں پر

کہیں ذرا بھی جو پیر پھسلا　　تو ٹکڑے ٹکڑے ہے کاسۂ سر

نزاکتِ راہ کی وہ حالت　　اور اُس پہ یہ تند و تیز صرصر

قدم قدم پر ہزار ٹھوکر

ہے دامنِ ہوش پارا پارا　　حواس بھی کر گئے کنارا

مگر چلے جا رہے ہیں رہرو　　کہ اب نہیں کوئی اور چارا

فضائے اُمّید کی جبیں پر　　چمک رہا ہے بس ایک تارا

کہ ہے تو فرزند ساتھ میں ہے　　عصائے پیری ہے یہ سہارا

چمک رہا ہے بس ایک تارا

نیندوں کی بستی

خاموش خاموش

اے دوست خاموش

اے رونے والے　اے فاتحہ خواں　یہ سرزمیں ہے　شہرِ خموشاں

سوتے پڑے ہیں　ہستی کے طوفاں　غم ہائے امروز　فردا کے ارماں

ناکامی دوش

خاموش خاموش

خاموش، خاموش

اے دوست خاموش!

بیٹھے ہیں مل کر سانجھ اور سویرا دھندلی ضیا ہے اجلا اندھیرا
اس وقت کوئی تیرا نہ میرا اترا ہوا ہے روحوں کا ڈیرا

آنکھوں سے روپوش

خاموش، خاموش

خاموش، خاموش

اے دوست خاموش

اے جنبشِ لب ہاں ہاں خبردار باطل نہ ہو جائے یہ سحر زنہار
ہیں آج یک جا عجز اور پندار پہلو بہ پہلو مجبور و مختار

ہشیار و مدہوش

خاموش، خاموش

خاموش، خاموش

اے دوست، خاموش

خاموشیوں میں گُم ہیں صدائیں   سینے کا رہیں سب یہ التجائیں
کس کو پکاریں کس کو بلائیں   یہ بیوی بچے یہ باپ مائیں

ہیں پنبہ در گوش

خاموش، خاموش

ایک لڑکی شاداں

یہ نظم میری عزیز بیٹی ارشاد بتول کی یادگار ہے

میں نے ایک مدت تک بچوں کے لیے نظمیں لکھی ہیں۔ ان کو میری سب سے بڑی بیٹی ارشاد بتول جسے میں پیار سے شاداں کہا کرتا تھا بڑے شوق سے پڑھتی تھی۔ اکتوبر ۱۹ ء میں جب میں نے پھول کی سالگرہ کیلئے متعدد نظمیں لکھیں تو ان میں ایک نظم یہ بھی تھی۔ اس وقت سفر میں تھا اور میرے بال بچے جالندھر میں جہاں شاداں مدرسہ بنات میں قرآن مجید پڑھ رہی تھی۔ اس نظم سے مقصود محض شاداں کو دق کرنا تھا۔ میں نے لکھا کہ وہ پڑھتی پڑھاتی کچھ نہیں، سارا دن کھیل کود میں ضائع کر دیتی ہے۔ خیال یہ تھا کہ اول تو وہ اس نظم کو اپنے نام پر دیکھ کر خوش ہو گی۔ جب اسے پڑھے گی تو چڑھ کر بیٹھے گی۔ وہ اس طرح خوب ہنسی مذاق رہے گا۔ ان پرلطف خیالات کے ساتھ جس روز میں گھر پہنچا اسی دن شام کو یہ بچی جو میری آنکھوں کا نور تھی اچانک کنوئیں میں گر کر جاں بحق تسلیم ہو گئی۔ پھول کا سالگرہ نمبر اس وقت ملا جب میں اپنے لخت جگر کو سپرد خاک کر چکا تھا۔

حفیظ

اک لڑکی تھی چھوٹی سی   دبلی سی اور موٹی سی

ننھی سی اور منی سی   بالکل تھی منتھنی سی

اس کے بال تھے کالے سے   سیدھے گھنگھریالے سے

منہ پر اس کے لالی سی　　چٹی سی مٹیالی سی

اس کی ناک پکوڑی سی　　نوکیلی سی چوڑی سی

آنکھیں کالی نیلی سی　　سرخ سفید اور پیلی سی

کپڑے اُس کے تھیلے سے　　اُجلے سے اور مَیلے سے

یہ لڑکی تھی بھولی سی　　پتلی سی اور گولی سی

ہردم کھیل تھا کام اس کا　　شاداں بی بی نام اس کا

ہنستی تھی اور روتی تھی　　جاگتی تھی اور سوتی تھی

ہردم اس کی اماں جان　　کھینچا کرتی اس کے کان

کہتی تھیں مکتب کو جا　　کھیلوں میں مت وقت گنوا

امی سب کچھ کہتی تھی　　شاداں کھیلتی رہتی تھی

○

اک دن شاداں کھیل رہی تھی۔　　آ نکلے اس کے ابا جی

وہ لاہور سے آئے تھے — چیزیں ویزیں لائے تھے

بکس میں تھیں یہ چیزیں سب — خیر تماشا دیکھو اب

ابا نے آتے ہی کہا — شاداں آ کچھ پڑھ کے سنا

گم تھی اک مدت سے کتاب — کیا دیتی اس وقت جواب

وہ بہن تھیں شاداں کی — چھوٹی ننھی منّی سی

نام تھا منجھلی کا سیاں — گڑیا سی ننھی نادان

وہ بولی اے ابّا جی — اب تو پڑھتی ہوں میں بھی

بلّی ہے سی اے ٹی کیٹ — چوہا ہے آر اے ٹی ریٹ

منہ ماؤتھ ہے ناک ہے نوز — اور گلاب کا پھول ہے روز

میں نے ابّا جی دیکھا — خوب سبق ہے یاد کیا

شاداں نے اس وقت کہا — "میں نے ہی تو سکھایا تھا"

لیکن امّاں نے چپ چاپ — کھولا بکس کو اٹھ کر آپ

اس میں جو چیزیں نکلیں — ساری سیماں کو دے دیں
اِک چینی کی گڑیا تھی — اِک جادو کی پڑیا تھی
اِک ننھی سی تھی موٹر — آپ ہی چلتی تھی فر فر
گیندوں کا اِک جوڑا تھا — اِک لکڑی کا گھوڑا تھا
اِک سیٹی تھی اِک باجا — ایک تھا مٹی کا راجا
شاداں کو کچھ بھی نہ مِلا — یعنی کھیل کی پائی سزا

اب وہ نا غور سے پڑھتی ہے
پورے طور سے پڑھتی ہے

○

ارشاد کی یاد میں

اک بار پھر وطن میں گیا، جا کے آ گیا
لختِ جگر کو خاک میں دفنا کے آ گیا

ہر گام پر سفر پہ خضر کا دھوکا ہوا مجھے
آبِ بقا کی راہ سے کترا کے آ گیا

حورِ لحد نے چھین لیا تجھ کو اور میں
اپنا سا منہ لیے ہوئے شرما کے آ گیا

دل لے گیا مجھے تری تربت پہ بار بار
آواز دے کے بیٹھ کے اُکتا کے آ گیا

رویا کہ تھا جہیز ترا واجب الادا
ملبہ موتیوں کا قبر پہ برسا کے آ گیا

میری بساط کیا تھی حضورِ رضائے دوست
تنکا سا اک سامنے دریا کے آ گیا

اب کے بھی راس آئی نہ حُبِّ وطن حفیظ
اب کے بھی ایک تیرِ قضا کھا کے آ گیا

ارشاد بیگم ۱۴ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو اچانک کنوئیں میں گر گئی۔ اور جاں بحق ہوئی اس وقت اس کی عمر بارہواں سال تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

نوٹ: سنہ ۱۹۴۷ء کی آفت۔ بلند حد کے دوستوں یعنی اہلِ وطن نے میری اس بچی کا مزار بھی کھود کر برباد کر دیا۔ حفیظ

کوثر چکد از لبم بہ ایں تشنہ لبی   خاور دمد از شبم بہ ایں تیرہ شبی

اے دستِ اَدَب کہ در حریمِ دلِ ماست

شاہنشہِ انبیاء رسولِ عَرَبی

گرامی

عیدِ میلادالنبیؐ

زندگی مُردہ تھی رُوحِ زندگی افسُردہ تھی
خامیٔ تخلیق اپنے آپ سے آزُردہ تھی

جلوے شرمندہ تھے اپنی خامیٔ تکمیل سے
عشق تھا رُو پوش اب تک حُسن کی قندیل سے

سازِ فطرت تھا ابھی مضراب سے ناآشنا
نغمہ تھا اک لذتِ بیتاب سے ناآشنا

سو رہی تھی زندگانی خواب کے آغوش میں
آرزوئیں دم بخود تھیں حسرتِ خاموش میں

باغ سے موجِ شمیمِ جانفزا اُٹھتی نہ تھی
نالۂ جانکاہِ بلبل کی صدا اُٹھتی نہ تھی

آنکھ تھی لیکن ابھی تک اشک سے محرُوم تھی
کامیابی کی تمنّا رشک سے محرُوم تھی

رُوح نے اب تک دعاؤں کے مزے پائے نہ تھے
خامشی نے التجاؤں کے مزے پائے نہ تھے

عالمِ ایجاد تھا کچھ اس طرح یعنی نہ تھا
آفرینش لفظ تھا، شرمندۂ معنی نہ تھا

یک بیک اُمید کے گھر میں خوشی پیدا ہوئی — زندگی کے واسطے اِک زندگی پیدا ہوئی

سینۂ ہستی میں کروٹ لی دلِ بیتاب نے — پڑھ لیا یعنی حرارت کا سبق سیماب نے

روئے فطرت پر محبت کی ضیا پیدا ہوئی — حُسن کی آنکھیں جھکیں اُن میں حیا پیدا ہوئی

ناگہاں ساکن ہواؤں میں روانی آگئی — اور چمن کے پتے پتے پر جوانی آگئی

سینۂ غنچہ میں اک میٹھی کسک پیدا ہوئی — گُل میں خوشبو اور شاخوں میں لچک پیدا ہوئی

سبزۂ خوابیدہ جاگا لہلہانے کے لئے — ہوگئیں بیتاب کلیاں مسکرانے کے لئے

آج زانوئے ازل پر صبح نے انگڑائی لی
مسکرا کر اک کرن نے ہاتھ میں شہنائی لی

غُل ہوا دنیا میں ختم المرسلیں پیدا ہوا — مخزنِ اسرارِ قدرت کا امیں پیدا ہوا

کشتیِ ارض و سما کا ناخدا پیدا ہوا — ابتدا و انتہا کا پیشوا پیدا ہوا

عرش پر سے شادیانوں کی صدا آنے لگی — سازِ الفت سے ترانوں کی صدا آنے لگی

فرش پر روح الامیں آنے لگے جانے لگے — طائرانِ قدس نغمے نعت کے گانے لگے

دھیمے دھیمے رس بھرے نغمے ہوا میں بس گئے ❘ میٹھے میٹھے گیت حوروں کے فضا میں بس گئے
بس گیا آ کر فضا میں لشکرِ نورانیاں ❘ اور پیشِ نورِ مطلق جھک گئیں پیشانیاں
پر فرشتوں کے کھلے انوار لہرانے لگے ❘ نور کے بادل زمیں پر پھول برسانے لگے
کعبۂ توحید پر رکھ کر جبیں سات آسماں ❘ جھک گئے تعظیم کو پیشِ زمیں سات آسماں

تھی یہ صبحِ زندگی تمہیدِ میلاد النبیؐ
اب خالق نے منائی عیدِ میلاد النبیؐ

ہلالِ عید

کر دیا شام نے تمام
دامنِ غرب لالہ فام

رنگ بھرے سحاب میں ڈوب گیا ہے آفتاب
چھپ نہ سکا نقاب میں خندۂ حسنِ بے حجاب

منظرِ باغِ پُر بہار
اور فرازِ کوہسار
چادرِ آبِ جوئبار
ہو گئے سب طلا نگار

نورِ شفق نے بھر دیئے رنگ سے کوہ سقف و بام
حسنِ نظر نے کر دیئے دیدہ و روح شاد کام

کر دیا شام نے تمام
دامنِ غرب لالہ فام

ہوگئی نرم رَو ہوا
محوِ سکوت ہے فضا

دن کے تھکے ہوئے کسان — اپنے گھروں میں آ گئے
دشت نورد ساربان — چشمۂ آب پا گئے

خوش ہیں تمام رُزہ دار
خوش ہُوا اُن سے کردگار

بند ہیں سارے کاروبار
آنکھ ہے وقتِ انتظار

منتظرِ نوید ہے — صبر و سکوں اُمید کا
ضبطِ دُرُود شہید ہے — تیغِ ہلال عید کا

ہوگئی نرم رَو ہوا
محوِ سکوت ہے فضا

آج ہیں سب جوان و پیر
ایک لکیر کے فقیر

طفلِ رُبا اُمنگ سے — شاہ و گدا نہال ہے
جوشِ طرب کے رنگ سے — چہرۂ شوق لال ہے

حُسن بھری ہلچلیاں
دیکھ رہی ہیں آسماں

چشمِ فلک سے بھی نہاں
محوِ نظر ہیں بیلیاں

شرخ شفق کی ڈھال میں — گڑ گئے بے شمار تیر
جستجوئے بلال میں — گُم ہیں کئی مہِ منیر

آج ہیں سب جوان و پیر
ایک لکیر کے فقیر

جوشِ خوشی سے یک بیک
بس گیا گنبدِ فلک

مسلمِ روزہ دار نے ختم کیا صیام
سازِ طرب کے تار نے توڑ دیا سکوتِ شام

دیکھ رہا ہے آسماں
آج زمین کا سماں

دشت و جبل میں ناگہاں
گونج اٹھیں سلامیاں

سُن کے ترانۂ دعا وجد میں آ گئے ملک
چھا گیا ایک نُور سا فرشِ زمیں سے عرش تک

جوشِ خوشی سے یک بیک
بس گیا گنبدِ فلک

مل گئی عید کی نوید

دیکھ لیا ہلالِ عید

ارض و سما میں دفعتاً   بانگِ اذاں ہوئی بلند

ایک صدا میں دفعتاً   ہو گئی ہر زبان بند

ایک جہانِ پاکباز

کر کے وضو پئے نماز

دل کو کئے ہوئے گداز

جھک گیا پیش بے نیاز

بندہ اِدھر، اُدھر خدا   لُطف اُدھر، اِدھر اُمید

عجز اِدھر، اُدھر عطا   گُفت اِدھر، اُدھر شُنید

مل گئی عید کی نوید

دیکھ لیا ہلالِ عید

شہیدوں کی عید

فرض پورا کر چکے، فرصت ملی ہر کام سے
مقبروں میں سو رہے ہیں آج کیا آرام سے

صبح کی صورت اُٹھے تھے رات کے آغوش سے
ہو گیا زندہ عمل کا جوش ان کے جوش سے

ان کا اُٹھنا تھا کہ تقدیرِ اخوت جاگ اُٹھی
خوابِ غفلت میں پڑی تھی آدمیت جاگ اُٹھی

ان سروں پر سایہ افگن تھا علم اسلام کا
ان لبوں پر وِرد تھا اللہ کے پیغام کا

آیۂ رحمت تھے یہ سارے زمانے کے لئے
آئے تھے اُجڑی ہوئی دنیا بسانے کیلئے

ہو گئیں آباد ان کے نام سے آبادیاں
رشکِ جنت بن گئیں ان کے لہو سے وادیاں

بام و در، کہسار و میداں خشک و تر، پست و بلند
ہو گئے اللہ والوں کی صدا سے بہرہ مند

زندگی میں بس گئے آبادکاروں کی طرح
زیست کی مدت گزاری روزہ داروں کی طرح

پیکرِ ہستی میں جب روحِ محبت بھر چکے
آئے تھے جس کام کو وہ کام پورا کر چکے

آخر ان کی عمر کا دن ڈھل گیا شام آگئی
یعنی صبحِ عید کا شب لے کے پیغام آگئی

آخری روزہ کیا افطارِ حق کے نام پر
بہرِ اظہارِ اطاعت جھک گئے سجدوں میں سر

قبلہ رُو ہو کر مصلّوں پر نشانی سو گئے
فتح کر کے جنگ کو مردانِ غازی سو گئے

رات ان کی ہے کہ روزِ عیش کی تمہید ہے
ان شہیدوں کے لئے صبحِ قیامت عید ہے

ہماری عید

یہ عید ہے روزہ داروں کی　　محبوبِ خدا کے پیاروں کی
جن کی طاعت مشکور ہوئی　　پروان چڑھی منظور ہوئی
سجدوں نے جبینیں چمکائیں　　منّت کی مُرادیں بر آئیں
محنت کا شجر پھل لایا ہے　　دن فضلِ خدا کا آیا ہے

یہ بخشش کی اُمید کا دِن
یاروں کیلئے ہے عید کا دن

رحمت کی گھٹائیں چھائی ہیں　　قبلے کی طرف سے آئی ہیں
وا ہیں توحید کے مے خانے　　اور گردش میں ہیں پیمانے
ساقیٔ ازل کی جو کھٹ ہے　　مستانِ الست کا جمگھٹ ہے

یہ سب اللہ کے دیوانے　　شمعِ وحدت کے پروانے

توحید کے نغمے گاتے ہیں

مل مل کر عید مناتے ہیں

ہم بدقسمت ہم بے چارے　　آزارِ فرقت کے مارے

عید آئی ہے کیسے مانیں　　ہم عید کی خوشیاں کیا جانیں

یثرب سے نہیں پیغام آیا　　غربت میں ماہِ صیام آیا

محبوب کے در سے دور رہے　　لاچار ہوئے مجبور رہے

جب نورِ خدا کی دید نہیں

یہ عید ہماری عید نہیں

میرا سلام لے جا

قسمت کے آسماں پہ میرا سے کہکشاں پر
چمکا ترا ستارا
اُس در پہ حاضری کا تجھ کو ہوا اشارا
اے بختیار بندے
اے کامگار بندے
تیری مراد مندی تقدیر کی بلندی
تجھ کو پکارتی ہے
آ باریاب ہو جا
اے ذرۂ محبت جا آفتاب ہو جا

دربار میں چلا ہے

سرکار میں چلا ہے

رخصتِ سفر اٹھا لے   اللہ کے حوالے

یثرب کے جانے والے   بس اک پیام لے جا

میرا سلام لے جا

میری یہ سرد آہیں   یہ منتظر نگاہیں

ان کا خیال کرنا

لیکن نہیں مناسب   کچھ عرضِ حال کرنا

وہ جانتے ہیں سب کچھ

پہچانتے ہیں سب کچھ

ناشاد آرزوئیں   برباد آرزوئیں

بے تاب ہو رہی ہیں

تاہم خموش رہنا

آنکھوں سے دیکھتا جا منہ سے مگر نہ کہنا
یہ صبح و شام میرے

سب سامنے ہیں تیرے
ان سے کوئی بھلائی دیتی نہیں دکھائی
لے جا سکے تو بھائی! یہ صبح و شام لے جا

میرا سلام لے جا
ہر چیز کھو چکا ہوں برباد ہو چکا ہوں
یہ زندگی ہے میری

اس وقت پاس میرے شرمندگی ہے میری
کچھ ارمغاں نہیں ہے
جز این و آں نہیں ہے
مفلس ہوں بے نوا ہوں کچھ بھی نہیں میں کیا ہوں

تحفے نہ مانگ مجھ سے
نادم نہ کر خدارا

دل تیرے پاس ہو تو دے دے مجھے "ادھارا"

میرا کلام کیا ہے
یہ جنسِ خام کیا ہے

یہ ارمغاں خوشی سے چاہے تو ہاں خوشی سے
اے مہرباں خوشی سے یہ جنسِ خام لے جا

میرا سلام لے جا

فریاد و ہا و ہو میں صہبائے آرزو میں
وہ جوش ہی نہیں ہے

ٹوٹا ہوا بھی ہے دل خاموش ہی نہیں ہے

سرشار کرنے والی
شے ہو چکی ہے خالی

مے خانۂ یقیں ہے   اُس کیفِ بہتریں سے

ایمانِ آتشیں سے

پھر اس کو بھر کے لانا

پینے چلا ہے تُو بھی   اور مجھ کو بھی پلانا

ٹوٹا ہوا ہے بے شک

چھوٹا ہوا ہے بے شک

ہے عرض دست بستہ   ہاں دُور کا ہے رستہ

اور جام بھی شکستہ   لیکن یہ جام لے جا

میرا سلام لے جا

یہ اشک ریز آنکھیں   طوفان خیز آنکھیں

اب خشک ہو چکی ہیں

دریا کہاں سے لائیں   قطرے کو رو چکی ہیں

ورنہ یہ آرزو تھی

مدت سے جستجو تھی

کشتی بنا کے دل کو　　اور پھر سجا کے دل کو

یثرب کے جانے والے

اس میں تجھے بٹھاؤں

دریائے سرمدی کے　　ساحل پہ لے کے جاؤں

خیر اے دلیر اچھا

ہوتی ہے دیر اچھا

جا ہر طرح سلامت　　لے جا مری محبت

لے جا مری عقیدت　　میرا سلام لے جا

میرا سلام لے جا

1906-1993

گلشنِ جنّت

وہ ملک جو ایک سمندر ہے لمبے چوڑے میدانوں کا
مجموعہ ریگستانوں کا اور ناہموار چٹانوں کا
اِک صحرا جس کے سینے پر آتش کے شرارے پھرتے ہیں
اِک ویرانہ جس میں سنّاٹے مارے مارے پھرتے ہیں
اک رقص کدہ خاموشی کا اک عشرت گاہ بگولوں کی
سنسان بیاباں جس میں فوجیں آسودہ ہیں غولوں کی
وہ دشت جہاں پُر شور ہوائیں گرد غبار اڑاتی ہیں
مٹی کی چھاؤنی چھاتی ہیں، مٹی کا فلک بن جاتی ہیں

طوفانی ریگِ رواں جس میں زہریلے طوفاں اُٹھتے ہیں
غصّے میں بھر کر کالے نیلے پیلے طوفاں اُٹھتے ہیں

وُہ مٹّی کے تودے جن پہ کرنوں کی بارش ہوتی ہے
وہ ریت جو رات کی چادر میں تاروں کے نیچے سوتی ہے
جو وسعت ذرّے ذرّے کو سودشت بنائے بیٹھی ہے
گنتی کے نخلستانوں کو دامن میں چھپائے بیٹھی ہے

ہاں ہاں وہ عرب جو گہوارہ ہے ظلمت سوز تمازت کا
رکھا ہے اسی پردے میں چھپا کر حق نے گلشن جنّت کا
یہ جنّت جس کی راہِ طلب میں ذرّہ ذرّہ سینا ہے
یہ شہر ہے کملی والے کا، اور اس کا نام مدینہ ہے

تین نغمے

شیگور ـــــ اقبال ـــــ حفیظ

تین نغمے

ہم نوا کوئی نہ پایا جب زمیں کے فرش پر
میرا نغمہ لے چلا مجھ کو اُڑا کر عرش پر

ظلمتِ ابلیس کی راہوں سے کتراتا ہوا
بندگی کے گیت اپنے رنگ میں گاتا ہوا

جادۂ پامالِ مہر و ماہ طے کرتا ہوا
مہ بہ مہ انجم بہ انجم راہ طے کرتا ہوا

کہکشاں تا کہکشاں بڑھتا گیا بڑھتا گیا
آسماں تا آسماں چڑھتا گیا چڑھتا گیا

یہ عبودیت کا نغمہ جانے کیا اعجاز تھا
جو ستارا میں نے دیکھا گوش بر آواز تھا

زہرۂ افلاک میری لے اُڑا کر لے گئی
نقش سوز و ساز کے دل میں بٹھا کر لے گئی

کارپردازانِ قدرت ہم سفر بنتے گئے
اپنی اپنی منزلوں تک راہبر بنتے گئے

مرحبا کہتے ہوئے ننھی سی مشتِ خاک پر
ہو گئے رخصت ستارے بامِ ہفت افلاک پر

دو فرشتے ساتھ چلتے چلتے آخر رہ گئے — اے بشر اب تیری جرأت ہے یہ فقرہ کہہ گئے

میں کہ تھا سرمستِ صہبائے ازل چلتا گیا
پاؤں تھک کر رہ گئے تو سر کے بل چلتا گیا

چلتے چلتے ایک ندی راہ میں حائل ہوئی — میرے ارمانوں کی منزل گاہ میں حائل ہوئی
ہلکی ہلکی پُر سکوں لہروں میں لہراتی ہوئی — میٹھے میٹھے گیت ٹھنڈی ریت پہ گاتی ہوئی
لہریا آبی دوپٹہ تا کمر لپٹا ہوا — دامنوں سے دامنِ شام و سحر لپٹا ہوا
عطر کی لپٹیں چلی آتی تھیں اس کے ساتھ ساتھ — تھی ہوا اُس کے لئے ہمراز مشاطہ کا ہاتھ
جھاڑیاں تھیں یا کہ سکھیاں تھیں قطار اندر قطار — نذر لاتی تھیں پھلوں کی ڈالیاں پھولوں کے ہار
نازنیں شاخیں لچکتیں سرسراتیں جھومتیں — اپنے اپنے عکس کا منہ آئنے میں چومتیں
قمریاں تھیں بلبلیں تھیں تیرو تھے تمشا تھے — شاد تھے دونوں کنارے شاد تھے آباد تھے
پھول سے کانٹا حسیں معلوم ہوتا تھا یہاں — سبزہ بیگانہ نہیں معلوم ہوتا تھا یہاں
میرے جی میں بس گئی اس کی سکوت افزا ہوا — میں یہ سمجھا ہو گیا میرا مقدر سازگار

پاؤں پھیلا کر خنک ندی میں سر دُھننے لگا
آبِ جُو کا نغمہ جادو اثر سُننے لگا

○

اب ہوا محسوس یہ سارا جہاں نغمے کا ہے
یہ زمیں نغمے کی ہے یہ آسماں نغمے کا ہے

یہ عجب نغمہ تھا، اطمینان بخش و بے خروش
یہ عجب نشہ تھا جس میں کوئی بیتابی نہ جوش

محوِ گلگشتِ چمن پہنے ہوئے کلیوں کے ہار
نغمہ تھا، یا شام کی ٹھنڈی نسیمِ خوشگوار

نغمہ کیا تھا حدّتِ خوں کیلئے برف آب تھا
یا تھکے ماندوں کی بستی میں نفیرِ خواب تھا

ہاں یہ نغمہ تھا لگی دل کی بجھانے کے لئے
برف بن کر رگوں میں بیٹھ جانے کیلئے

نغمہ خواب آور تھا نیند آنے لگی میں سو گیا
اپنی منزل بھول کر اس رنگ و بو میں کھو گیا

اصل میں ندی نہ میدانِ گل و لالہ تھا یہ
نغمۂ ٹیگور تھا یہ سحرِ بنگالہ تھا یہ

دیکھ کر نغمے کا یہ افسوں میں حیراں ہو گیا
میری جمعیت کا شیرازہ پریشاں ہو گیا

پھول تھے خوشبو تھی نشہ تھا، فضا تھی میں نہ تھا
ساز کی دھڑکن تھی، نغمے کی صدا تھی میں نہ تھا

میری اپنی رُوح کے نغمے کی لے کم ہو گئی　　قلب کو گرمانے والی کوئی شے کم ہو گئی
ہو گیا یخ بستہ مَیں بھی اور میرا سانس بھی　　بیٹھ جائے دل تو اُٹھ سکتی نہیں آواز بھی
یاد مجھ کو اب وہ پہلی زندگی آنے لگی　　یعنی اس افتاد سے شرمندگی آنے لگی
تازیانہ بن گیا بہرِ عمل یہ انفعال　　دفعتاً پیدا ہُوا خود اعتمادی کا خیال
جاگ اُٹھا مَیں اور کنارے ہی کنارے چل پڑا　　سرنگوں ہارے ہُوئے دل کے سہارے چل پڑا
چل رہے تھے پاؤں اپنے حال سے بے حال سے　　خود بخود تھک جانے والی ڈگمگاتی چال سے
اِس طرح طے کر گیا مَیں سرحدِ ادراک بھی　　میرا منہ تکنے لگی اب جرأتِ بیباک بھی
سامنے دیکھا، تو اک دریا نظر آیا مجھے　　میری منزل آ گئی ایسا نظر آیا مجھے
مل گئی تھی جا کے دریا سے یہ پیاری جُوئے آب　　یعنی اپنے مدعا میں ہو گئی تھی کامیاب
یہ عروسِ فکرِ رنگیں بن سنور کر آئی تھی　　دامنِ آبِ رواں میں پھول بھر کر لائی تھی

اِک محبت اِک مسرت کے نرالے جوش میں
لے لیا تھا بڑھ کے دریا نے اسے آغوش میں

پھر مرے ذوقِ عمل کو اک سہارا مل گیا   وہ کنارا مجھ سے چھوٹا یہ کنارا مل گیا

ہاں یہ دریا تھا مگر دریائے ناپیدا کنار   خوشنما، پُر خو، نغمہ آفریں اور پُر وقار

سیل در آغوشِ سیل اور موج در آغوشِ موج   ہر طرف پُر جوش لشکر ہر طرف پُر جوش فوج

اندرونِ تہ سے لہر اٹھتی ہوئی بڑھتی ہوئی   ولولوں کی طرح ہر سو پھیلتی بڑھتی ہوئی

تھے سکوں ناآشنا، لہریں بھی اور گرداب بھی   اپنی اپنی رَو میں تھے طوفان بھی سیلاب بھی

ایک طوفانِ تلاطم ایک سیلابِ رواں   ظاہراً آبِ رواں باطن میں سیلابِ رواں

سازِ قدرت واصلِ مضراب تھا دریا نہ تھا

اک مسلسل نغمۂ بیتاب تھا دریا نہ تھا

ہو گئی بیدار میرے نغمۂ ہستی کی گونج   قلب سے اٹھی پرانے جوش و مستی کی گونج

جس طرح آجائے پیاسا ساحلِ مطلوب پر   یا اچانک کوئی جا پہنچے درِ محبوب پر

اب یہ طوفانِ حیات افزا تھا میرے سامنے

نغمۂ اقبال کا دریا تھا میرے سامنے

درد کی چیخیں اُٹھیں میرے شکستہ ساز سے
آبدیدہ ہو گیا دریا میری آواز سے

میرا نغمہ نغمۂ دریا سے کم آواز تھا
ہاں مگر ہم رنگ و ہم آہنگ و ہم آواز تھا

ہوش نے چاہا کہ فکرِ خود فراموشی کروں
قطرہ ہوں دریا سے مل جاؤں ہم آغوشی کروں

اپنی ہستی کا ابھی تک تھا مگر دھوکا مجھے
شوق نے آگے بڑھایا ضبط نے روکا مجھے

لڑکھڑائے پائے ہمت عشق کے آداب میں
ایک لرزش سی ہوئی پیدا میرے اعصاب میں

کھینچنے کو دوڑ کر موجوں کی زنجیریں بڑھیں
روکنے کو حفظِ خودداری کی تدبیریں بڑھیں

یہ خودی یہ سیلِ خودی یہ ضبط اور یہ اشتیاق
اس طرح اُلجھے کہ آخر بن گئے دامِ فراق

مدّعائے زیست حاصل ہوتے ہوتے رہ گیا
جُزو اپنے کُل سے واصل ہوتے ہوتے رہ گیا

جوہرِ ذاتی

مدّتوں سے اشک کے سیلاب میں بہتا ہے دِل
سختیاں ہر موجِ طوفاں خیز کی سہتا ہے دِل

دل میں سب کچھ ہے مگر مُنہ سے نہیں کہتا ہے دِل
التجا کیسی، دُعا سے مُحترز رہتا ہے دِل

حاجتیں لاکھوں ہیں لیکن مانگنے سے عار ہے
شکر کرتا ہوں کہ میرا دل بہت خوددار ہے

اپنے دامن میں لیا ہے بارگاہوں نے مجھے
اپنے پہلو میں بٹھایا بادشاہوں نے مجھے

بارہا تا کا ہے بخشش کی نگاہوں نے مجھے
اور پناہیں پیش کیں عالم پناہوں نے مجھے

رُعبِ دولت کا مگر دل پر مرے چھایا نہیں
کچھ طلب کرنے کو میں نے ہاتھ پھیلایا نہیں

عرش کی رفعت لیے بیٹھا ہوں فرشِ خاک پر
سر مرا آسودہ ہے پائے رسولِ پاک پر

اہلِ زر ہنستے ہیں میرے دامنِ صد چاک پر
اور میں نازاں ہوں اپنی فطرتِ بیباک پر

میری فطرت نے دیا ہے جوہرِ ذاتی مجھے
دُنیوی شاہوں کی مدّاحی نہیں آتی مجھے

صداہ صحرا

درۂ خیبر

نہ اِس میں گھاس اُگتی ہے نہ اس میں پھول کھِلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے مِلتے ہیں
کڑکتی بجلیوں کی اس جگہ چھاتی دہلتی ہے
گھٹا بچ کر نکلتی ہے ہوا کترا کے چلتی ہے
یہ ناہموار چٹیل سلسلے کالی چٹانوں کے
امانت دار لاثانی پرانی داستانوں کے
یہی پگڈنڈیاں نیرنگِ ہستی کی نظیریں ہیں
یہی تو قسمتِ اقوام کی خونیں لکیریں ہیں

یہ ذرّے رہروؤں کی ہمتوں پہ مسکراتے ہیں
زبانِ حال سے ماضی کے افسانے سناتے ہیں
یہ پتھر قافلے والوں کے ٹھکرائے ہوئے سے ہیں
کسی آتش قدم کی راہ میں آئے ہوئے سے ہیں
لئے بیٹھی ہیں یہ ویرانیاں محشر کے ہنگامے
ہیں ان سنسانیوں میں فن دنیا بھر کے ہنگامے
یہ بے آباد، دہشت ناک وحشت خیز ویرانہ
ہے لاتعداد شور انگیز تہذیبوں کا افسانہ
انہی وشواریوں سے آریوں کا کارواں گذرا
زمینِ ہند پہ جاتا ہوا اک آسماں گذرا
اسی رستے سے ہو کر ہُنس اور اہلِ تتار آئے
کئی خانہ خراب آئے، کئی آباد کار آئے

یہ مٹی شانِ اسکندر کی ہے آئینہ دار اب تک
اُسی آندھی کا باقی ہے یہاں گرد و غبار اب تک

اِسی تابش میں چمکی تھیں مسلمانوں کی شمشیریں
اِنہی فولاد کے دیووں سے ٹکرائی تھیں تکبیریں

فلک نے اِس زمیں پر بارہا محمودؒ کو دیکھا
بہادر غوریوں کے طالعِ مسعود کو دیکھا

اُڑی یہ خاک برسوں تک غبارِ کارواں ہو کر
فلک پر چھا گئی دلدوز آہوں کا دھواں ہو کر

اِسے تیمور نے روندا اسے بابر نے ٹھکرایا
مگر اِس خاک کی عالی وقاری میں نہ فرق آیا

یہاں سے بارہا گزرے اُٹھائے بارگاہوں کے
قدم بوسے ہیں اِس مٹی نے اکثر بادشاہوں کے

کہاں اب وہ شکوہِ نادری اقبالِ ابدالی
لیا کرتے تھے جن سے سخت پتھر درس پامالی

یہ ہے وہ خارزار اس میں ہزاروں آبلے پھوٹے
نہیں ٹوٹے مگر یہ سنگدل کانٹے نہیں ٹوٹے

ہوائے دردہ خیبر ہے محوِ انتظار اب بھی
کہ آجائے کوئی رہوارِ وحشت پر سوار اب بھی

آخری رات

سیاہی بن کے چھایا شہر پر شیطان کا فتنہ
گناہوں سے لپٹ کر سو گیا انسان کا فتنہ
پناہیں حسن نے پائیں سیہ کاری کے دامن میں
وفاداری ہوئی روپوش ناداری کے دامن میں
میسر ہیں زری کے شامیانے خوش نصیبی کو
اڑھا دی سایۂ دیوار نے چادر غریبی کو
مشقت کو سکھا کر خوبیاں خدمت گذاری کی
ہوئیں سب بے خوف سے ایمانیاں سرمایہ داری کی
لیا آغوش میں پھولوں کی سیجوں نے امیری کو
مہیا خاک ہی نے کر دیے آسن فقیری کو

تڑپنا چھوڑ کر چپ ہو گئے جی ہارنے والے

مزے کی نیند سوئے تازیانے مارنے والے

وہ روحانی وہ جسمانی عقوبت کم ہوئی آخر

غلامی بیڑیوں کے بوجھ سے بے دم ہوئی آخر

ہوئے فریادیوں پر بند ایوانوں کے دروازے

کہ خود محتاجِ دربان ہیں جہانبانوں کے دروازے

اِسی انداز سے جاسوئی غفلت بادشاہوں کی

سرور و کیف بن کر چھا گئیں نیندیں گناہوں کی

شرابیں ختم کر کے ہو گئے خاموش ہنگامے

بالآخر نیند آئی سو گئے پُرجوش ہنگامے

تھما جب زندگی کا جوش پُرخاش اجل جاگی

عمل کو دیکھ کر مدہوش پاداشِ عمل جاگی

اُٹھایا موت نے پتھر جہنّم کے دہانے سے
جہاں آتش کا دریا کھولتا تھا اک زمانے سے

بلندی سے تباہی کے سمندر نے کیا دھاوا
چٹانوں کے جگر سے پھوٹ نکلا آتشیں لاوا

دکھا دی آگ ایوانوں کو مظلومی کی آہوں نے
اُٹھائے شعلہ ہائے آتشیں بیکس نگاہوں نے

اُٹھیں مختار بن کر بے کسی کے خون کی موجیں
حصارِ مرگ نے محصور کر لیں جنگ جو فوجیں

نہ حسن و عشق نے پائی اماں قہرِ الٰہی سے
دبی پاداش امیری سے فقیری سے نہ شاہی سے

ستاروں کی نگاہوں نے دھواں اُٹھتا ہوا دیکھا
مگر خورشید نے کچھ بھی نہ مٹّی کے سوا دیکھا

رشحہ

اُٹھی ہے مغرب سے گھٹا پینے کا موسم آگیا

ہے رقص میں اِک مہ لقا

نازک ادا نازآفریں

ہاں ناچتی جا گاتے جا نظروں سے دل برماتے جا

تڑپاتے جا تڑپاتے جا

اور دشمنِ دنیا و دیں

تیرا نظر کتا خوب ہے تیری ادائیں دل نشیں

لیکن ٹھہر تو کون ہے او نیم عریاں نازنیں

کیا مشرقی عورت ہے تو ہرگز نہیں ہرگز نہیں

تیری ہنسی بے باک ہے

تیری نظر چالاک ہے"

اُف کس قدر دل سوز ہے تقدیر بازاری تری
کتنی ہوس آموز ہے یہ سادہ پُرکاری تری

شرم اور عزّت والیاں
ہوتی ہیں عفّت والیاں

وہ حُسن کی شہزادیاں پردے کی ہیں آبادیاں
چشمِ فلک نے آج تک دیکھی نہیں اُن کی جھلک

سرمایۂ شرم و حیا زیور ہے اُن کے حُسن کا
شوہر کے دُکھ سہتی ہیں وہ مُنہ سے نہیں کہتی ہیں وہ

کب سامنے آتی ہیں وہ غیرت سے کٹ جاتی ہیں وہ
اعزازِ ملّت اُن سے ہے نامِ شرافت اُن سے ہے

ایمان پر قائم ہیں وہ پاکیزہ و صائم ہیں وہ

تجھ میں نہیں شرم و حیا
تجھ میں نہیں مہر و وفا!

سچ سچ بتا تو کون ہے؟
اے بے حیا تو کون ہے؟

احساسِ عزت کیوں نہیں
شرم اور غیرت کیوں نہیں

یہ پُر فسوں غمزے ترے
نامحرموں کے سامنے

ہٹ سامنے سے دور ہو
مردود ہو، مقہور رہو

تقدیر کی بیٹی ہے تو
شیطان کی بیٹی ہے تو

جس قوم کی عورت ہے تو
اس قوم پر لعنت ہے تو

لیکن ٹھہر جانا ذرا
تیری نہیں کوئی خطا

مردوں میں غیرت ہی نہیں
قومی حمیت ہی نہیں

وہ ملتِ بیضا کہ تھی
سارے جہاں کی روشنی

جمعیتِ اسلامیاں
شاہنشہِ ہندوستاں

اب اس میں دم کچھ بھی نہیں
ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں

ملی سیاست اٹھ گئی   بازو کی طاقت اٹھ گئی

شانِ حجازی اب کہاں   وہ ترکتازی اب کہاں

اب غزنوی ہمت گئی   اب بابری شوکت گئی

ایمان عالمگیر کا   مسلم کے دل سے اٹھ گیا

قوم اب جفا پیشہ ہوئی   عزت گدا پیشہ ہوئی

اب رنگ ہی کچھ اور ہے   بے غیرتی کا دور ہے

یہ قوم اب مٹنے کو ہے   یہ نرد اب پٹنے کو ہے

افسوس یہ ہندوستاں!

یہ گلشنِ جنت نشاں!

ایمان دار دل کا وطن   طاعت گزاروں کا وطن

رہ جائے گا ویرانہ پھر   بن جائے گا بت خانہ پھر

لیکن مجھے کیا خبط ہے: تقریر کیوں بے ربط ہے

ایسا بہک جاتا ہوں میں منہ آئی بک جاتا ہوں میں

اتنا شرابی ہو گیا عقل و خرد کو کھو گیا

مجھ کو زمانے سے غرض مٹنے مٹانے سے غرض؟

ہندوستان سے کام کیا اندیشۂ انجام کیا

جینے دو جینے دو مجھے

پینے دو پینے دو مجھے

جب حشر کا دن آئے گا اُس وقت دیکھا جائے گا

ہاں ناچتی جا گائے گا نظروں سے دل بچائے گا

تڑپائے جا تڑپائے جا

او دشمنِ دنیا و دیں

کنجوس سرمایہ دار

آنکھیں اندھی، دل بھی اندھا، اندھی تیری قسمت بھی
قبر صفت گھر میں بھی اندھیرا، اندھی ہے یہ دولت بھی

ظالم تیرے ہاتھوں نے مسکینوں کے دل توڑے ہیں
ظلم کیے ہیں حق چھینے ہیں، تب یہ پیسے جوڑے ہیں

لعنت دُنیا بھر کی تُو نے خُوب اکٹھی کر لی ہے
لاکھوں جیبیں خالی کر کے اپنی تھیلی بھر لی ہے

مال خزانہ پاس ہے تیرے لیکن اطمینان نہیں
اطمینان کہاں سے آئے، جب دل میں ایمان نہیں

یہ بے فیض خزانہ تیرا، تیرے کام نہ آئے گا
تُو نے دُنیا کو ترسایا، یہ تجھ کو ترسائے گا

چین تری تقدیر میں ہرگز او سرمایہ دار نہیں
مزدوروں کی چیخیں ہیں اشرفیوں کی کھنکار نہیں
تنہائی میں اندیشوں کے بھوت ستاتے ہیں تجھ کو
تیری دولت چھیننے والے ہاتھ دکھاتے ہیں تجھ کو
ہتھیلی کھول کے ہو جاتا ہے حال بُرا ہر بار ترا
کرے گی یہ دولت آخر اک دن "بیڑا پار" ترا

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم

اگر کوئی بے نقاب کر دے

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کر دے

حقیقتیں آشکار کر دے، صداقتیں بے حجاب کر دے
ہر ایک ذرّہ یہ کہہ رہا ہے کہ آ مجھے آفتاب کر دے

یہ خوب کیا ہے یہ زشت کیا ہے جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے؟
بڑا مزا ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے

کہو تو رازِ حیات کہہ دوں حقیقتِ کائنات کہہ دوں
وہ بات کہہ دوں کہ پتھروں کے جگر کو بھی آب آب کر دے

خلافِ تقدیر کر رہا ہوں، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں خدا اگر کامیاب کر دے

ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
مری خطائیں شمار کر لے مری سزا کا حساب کر دے

حفیظ سب سے بڑی خرابی ہے عشق میں لطفِ کامیابی
کسی کی دُنیا تباہ کر دے، کسی کی عقبےٰ خراب کر دے

سزا دے گئے مجھے

ایسا سبق مرے رُفقا دے گئے مجھے
اپنے لہو کے گھونٹ مزا دے گئے مجھے

یعنی میں نامُراد بھی ہوں بیوقوف بھی
کچھ اس طرح وہ دادِ وفا دے گئے مجھے

آخر طبیب نے بھی اُنہی سے کیا رجوع
وہ آئے مسکرائے شفا دے گئے مجھے

وہ مجھ سے آج عہدِ وفا لینے آئے تھے
جاتے ہوئے فریبِ وفا دے گئے مجھے

جن سے کوئی اُمید نہ تھی اُن سے کیا اُمید
جن سے اُمید تھی وہ دغا دے گئے مجھے

فرما گئے بزرگ کہ "عمرت دراز باد"
میری شرارتوں کی سزا دے گئے مجھے

پشیمانیاں ہیں

وفاداریاں سخت نادانیاں ہیں   کہ ان کے نتیجے پشیمانیاں ہیں

پشیمانیاں ہیں گناہوں پہ لیکن   بڑے ہی مزے کی پشیمانیاں ہیں

مری زندگی پر تعجب نہیں تھا   مری موت پر اُن کو حیرانیاں ہیں

محبت کرو اور نباہو تو پوچھو   یہ دشواریاں ہیں کہ آسانیاں ہیں

ندامت ہوئی حشر میں جن کے بدلے   جوانی کی دو چار نادانیاں ہیں

مرا تجربہ ہے کہ اس زندگی میں

پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں

اب تو رہنے دو یہ دُنیاداریاں

حسن نے سیکھیں غریب آزاریاں عشق کی مجبوریاں لاچاریاں

بہہ گیا دل حسرتوں کے خون میں لے گئیں بیمار کو بیماریاں

سوچ کر غم دیجئے، ایسا نہ ہو آپ کو کرنی پڑیں غمخواریاں

دار کے قدموں میں بھی پہنچی نہ عقل عشق ہی کے سر رہیں سرداریاں

اِک طرف جنسِ وفا قیمت طلب اِک طرف مَیں اور مری ناداریاں

ہوتے ہوتے جان دوبھر ہو گئی بڑھتے بڑھتے بڑھ گئیں بیزاریاں

تُم نے دُنیا ہی بدل ڈالی مری
اب تو رہنے دو یہ دُنیاداریاں

گفتگو تو شریفانہ چاہیے

مل جائے مے تو سجدۂ شکرانہ چاہیے ۔۔۔ پیتے ہی ایک لغزشِ مستانہ چاہیے

ہاں احترامِ کعبہ و بت خانہ چاہیے ۔۔۔ مذہب کی پوچھیے تو جُداگانہ چاہیے

رندانِ مے پرست سیہ مست ہی سہی ۔۔۔ اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیے

دیوانگی ہے عقل نہیں ہے کہ خام ہو ۔۔۔ دیوانہ ہر لحاظ سے دیوانہ چاہیے

اس زندگی کو چاہیے سامانِ زندگی ۔۔۔ کچھ بھی نہ ہو تو شیشہ و پیمانہ چاہیے

او ننگِ اعتبار دعا پہ نہ رکھ مدار ۔۔۔ او بیوقوف ہمتِ مردانہ چاہیے

رہنے دے جامِ جم مجھے انجامِ جم سنا
کھل جائے جس سے آنکھ وہ افسانہ چاہیے

خدا کا سہارا لئے ہوئے

میرے خیال و خواب کی دنیا لئے ہوئے
پھر آ گیا کوئی رخِ زیبا لئے ہوئے

پھر دل میں آ بسی ہے کسی انجمن کی یاد
اجڑے ہوئے بہشت کا نقشا لئے ہوئے

یہ گم نگاہیاں ہیں تو پھر کس امید پر
بیٹھا رہوں فریبِ تمنا لئے ہوئے

دل گیسوئے بتاں میں الجھ کر نہ گر پڑے
اٹھا تو ہے خدا کا سہارا لئے ہوئے

اس فتنۂ شباب کا عالم نہ پوچھئے
اک حشر اٹھ رہا ہے تماشا لئے ہوئے

حسرت برس رہی ہے رخِ نامراد پر
یہ کون جا رہا ہے تمنا لئے ہوئے

آئی ہے بے حجاب مرا امتحاں خریدنے
دنیا کھڑی ہے دولتِ دنیا لئے ہوئے

گو آج تک کسی سے توقع نہ تھی حفیظ
پھرتا ہوں اک جہان کا شکوا لئے ہوئے

ایجاد میری

نہ کر دلجوئی اے صیّاد میری — کہ فطرت ہے بہت آزاد میری

اسیری سے رہائی پانے والو — تمہیں پہنچے مبارک باد میری

سہارا کیوں لیا تھا ناخدا کا — خدا بھی کیوں کرے امداد میری

بھلا دو مجھ کو لیکن یاد رکھنا — ستائے گی تمہیں بھی یاد میری

فرشتے کیا مرتب کر سکیں گے — بہت بے ربط ہے روداد میری

پسند آنے لگی تھی سربلندی — یہی تھی اوّلیں افتاد میری

کیا پابندِ نَے نالے کو میں نے — یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

مرے اشعار پر چپ رہنے والے — ترے حصے میں آئی داد میری

قضا کا ظلم حد سے بڑھ گیا ہے — کوئی سنتا نہیں فریاد میری

خداوندا قضا نے چھین لی ہے

مرے آغوش سے ارشاد میری

بہت مشہور ہوں میں

خرد مند و خرد سے دور ہوں میں
بہت خوش ہوں بہت مسرور ہوں میں

مری مجبوریاں کیا پوچھتے ہو
کہ جینے کے لیے مجبور ہوں میں

جلاتے ہو مجھے کیوں چٹکلوں سے
نہ موسیٰ ہوں نہ سنگِ طور ہوں میں

نہیں کرتا عزیزوں کی شکایت
عزیزو ہاں بہت مغرور ہوں میں

مجھے سمجھا رہے ہو، جاؤ جاؤ
شہیدِ سعیِ نا مشکور ہوں میں

مری دنیا کا سرمایہ ہے عقبیٰ
بڑی تنخواہ کا مزدور ہوں میں

کسی نے بھی نہ پہچانا وطن میں
میں سمجھا تھا بہت مشہور ہوں میں

مجھے کر دو غریقِ حوضِ کوثر
خرابِ بادۂ انگور ہوں میں

ہائے دُنیائے فانی

نہ دردِ محبّت نہ جوشِ جوانی — یہ جنّت ہے، تو ہائے دُنیائے فانی
تو پھر آگئی گردشِ آسمانی — بڑی مہربانی! بڑی مہربانی!!
سُناتا ہے کیا حیرت انگیز قصّے — حسینوں میں کھوئی ہو جس نے جوانی
نظر اور ذوقِ نظر دینے والے — عجب شے بنا دی ہے دُنیائے فانی
نصیحت سے روکا بہت ناصحوں کو — کسی نے ہماری نصیحت نہ مانی
تسلّی دیئے جاؤ نادان دل کو — کہے جاؤ باتیں زبانی زبانی

حفیظؔ اپنی بولی محبّت کی بولی
نہ اُردو نہ ہندی نہ ہندوستانی

ایمان بھی نثار کرے

گنہ کے بعد بشر عجز اختیار کرے

خدا کی شانِ کریمی پہ اعتبار کرے

نہ دلدہی نہ تسلّی، نہ وعدہ ہے نہ وفا

تمہیں کہو تمہیں کس دل سے کوئی پیار کرے

خدا پرست وہی ہے، جو اس زمانے میں

بتوں پہ جان بھی ایمان بھی نثار کرے

فغاں کے واسطے دردِ سلیم ہے درکار

یہ جس کے پاس نہ ہو صبر اختیار کرے

کوئی اگر دیوانہ ہو جائے

نگاہِ آرزو آموز کا چرچا نہ ہو جائے
شرارت سادگی ہی میں کہیں رسوا نہ ہو جائے

انہیں احساسِ تمکیں ہو کہیں ایسا نہ ہو جائے
جو ہونا ہو، ابھی لے جرأتِ رندانہ ہو جائے

بظاہر سادگی سے مسکرا کر دیکھنے والو
کوئی کمبخت ناواقف اگر دیوانہ ہو جائے

بہت ہی خوب شے ہے اختیاری شانِ خودداری
اگر معشوق بھی کچھ اور بے پروا نہ ہو جائے

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے

الٰہی دل نوازی پھر کریں وہ مے فروش آنکھیں
الٰہی اتحادِ شیشہ و پیمانہ ہو جائے

مری الفت تعجب ہو گئی، توبہ معاذاللہ
کہ منہ سے بھی نہ نکلے بات اور افسانہ ہو جائے

یہ تنہائی کا عالم؛ چاند تاروں کی یہ خاموشی!
حفیظ اب لطف ہے اک نعرۂ مستانہ ہو جائے

نہ دبے آسماں سے ہم

نا آشنا نہیں رہ و رسمِ جہاں سے ہم
لائیں مگر فریب کی صورت کہاں سے ہم

یہ اعترافِ عجز بھی معیوب ہے تو خیر
چپ ہو رہیں گے کچھ نہ کہیں گے زباں سے ہم

ہاں اس لئے کہ خاک کا رتبہ بلند ہو
مٹ مٹ گئے دبے نہ مگر آسماں سے ہم

اغیار کی بھی آؤ بھگت خوب یاد ہے
اس روز خوش ہوئے تھے بہت میہماں سے ہم

اے زندگی سپردِ خدا کر دیا تجھے
بے فکر ہو گئے ترے سود و زیاں سے ہم

وہ روحِ زندگی نہیں شرمندگی سہی
خالی نہ جائیں گے درِ پیرِ مغاں سے ہم

تم سے بھی پوچھا جائے گا

زندگی کا لطف بھی آجائے گا
زندگانی ہے تو دیکھا جائے گا

جس طرح لکڑی کو کھا جاتا ہے گھن
رفتہ رفتہ غم مجھے کھا جائے گا

حشر کے دن میری چپ کا ماجرا
کچھ نہ کچھ تم سے بھی پوچھا جائے گا

مسکرا کر، منہ چڑا کر گھور کر
جا رہے ہو خیر دیکھا جائے گا

کر دیا ہے تم نے دل کو مطمئن
دیکھ لینا سخت گھبرا جائے گا

حضرتِ دل کام سے جاؤں گا میں
دل لگی میں آپ کا کیا جائے گا

دوستوں کی بے وفائی پر حفیظ
صبر کرنا بھی مجھے آ جائے گا

بہار آئی گلستاں میں

اُمیدیں مٹ گئیں آخر ہجومِ یاس و حرماں میں
یہ فتنے سو گئے نیند آ گئی آغوشِ طوفاں میں
بڑھا دے کشتیٔ مے ہر چہ باد اباد اے ساقی
خدا کے آسرے پر چھوڑ دے دریائے عصیاں میں
مری آنکھیں ہیں آزادی کی دو بے رنگ تصویریں
لگی ہیں مدتوں سے روزنِ دیوارِ زنداں میں
خیال و خواب کا ہنگامہ ہے یا اور بھی کچھ ہے
یہ نور و نار کا جھگڑا ہے کیا گبر و مسلماں میں
وہی اِک نالۂ ماتم وہی اک نغمۂ شادی
کبھی صیّاد کے گھر میں کبھی صحنِ گلستاں میں

۱ کبھی زلفِ مسلسل کی حکایت چھیڑ اے ناصح
کہیں تو ربط پیدا کر خیالاتِ پریشاں میں

اِدھر صیّاد پھرتے ہیں، اُدھر صیّاد پھرتے ہیں
بہار آئی گلستاں میں، بہار آئی گلستاں میں

مجھے بھی تک رہی ہیں اب وہ آنکھیں جن کے جادو سے
غزالانِ حرم آوارہ ہیں کوہ و بیاباں میں

بُری ساعت میں جاگا تھا یہ فتنہ حُسن و اُلفت کا
کہ برپا ہے قیامت آج تک دُنیائے اِنساں میں

بہت آغاز دیکھے ہیں بہت انجام دیکھے ہیں
کئی عبرت کی تصویریں کھنچی ہیں چشمِ حیراں میں

جنوں کی اب نہ پوچھو بس یہ سمجھو سانس لیتا ہوں
یہی اک تار باقی ہے گریبانِ رگِ جاں میں

کیا ہو گیا ہوں میں

اے دوست مٹ گیا ہوں فنا ہو گیا ہوں میں
اِس دردِ دوستی کی دوا ہو گیا ہوں میں

قائم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو
دُنیا سمجھ رہی ہے فنا ہو گیا ہوں میں

ہنسنے کا اعتبار نہ رونے کا اعتبار
یہ زندگی ہے جس پہ فدا ہو گیا ہوں میں

ہمت بلند تھی مگر افتاد دیکھنا
چُپ چاپ آج محوِ دعا ہو گیا ہوں میں

نا آشنا ہیں رُتبۂ دیوانگی سے دوست
کمبخت جانتے نہیں کیا ہو گیا ہوں میں

یہ زندگی فریبِ مسلسل نہ ہو کہیں
شاید اسیرِ دامِ بلا ہو گیا ہوں میں

اُٹھتا ہوں اِک جہانِ خموشی لیے ہوئے
ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا ہو گیا ہوں میں

ہاں کیفِ بیخودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے
محسوس ہو رہا تھا خدا ہو گیا ہوں میں

خُدا کو یاد کر لیتا ہُوں مَیں

مِٹنے والی حسرتیں ایجاد کر لیتا ہُوں مَیں
جب بھی چاہوں اِک جہاں آباد کر لیتا ہُوں

مجھ کو اِن مجبُوریوں پر بھی ہے اتنا اختیار
آہ بھر لیتا ہُوں مَیں فریاد کر لیتا ہُوں مَیں

حُسن بے چارہ تو ہو جاتا ہے اکثر مہرباں
پھر اُسے آمادۂ بیداد کر لیتا ہُوں مَیں

تُو نہیں کہتا، مگر دیکھا ہے وفا ناآشنا
اپنی ہستی کس قدر برباد کر لیتا ہُوں مَیں

ہاں یہ ویرانہ، یہ دل، یہ آرزوؤں کا مزار
تم کہو تو پھر اسے آباد کر لیتا ہُوں مَیں

جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے حفیظؔ
ایک عادت ہے خُدا کو یاد کر لیتا ہُوں مَیں

ملی ہے زندگی فانی مجھے

ہے ازل کی اس غلط بخشی پہ حیرانی مجھے
عشق لافانی ملا ہے زندگی فانی مجھے

مَیں وہ بستی ہُوں کہ یادِ رفتگاں کے بھیس میں
دیکھنے آتی ہے اب میری ہی ویرانی مجھے

تھی یہی تمہید میرے ماتمی انجام کی
پھُول ہنستے ہیں تو ہوتی ہے پشیمانی مجھے

حسن بے پردہ ہُوا جاتا ہے یارب کیا کروں
اب تو کرنی ہی پڑی دل کی نگہبانی مجھے

باندھ کر روزِ ازل شیرازۂ مرگ و حیات
سونپ دی گویا دو عالم کی پریشانی مجھے

پوچھتا پھرتا تھا داناؤں سے اُلفت کے رمُوز
یاد اب رہ رہ کے آتی ہے وہ نادانی مجھے

۱

سب کچھ حسین ہے

محبت کی دنیا میں سب کچھ حسیں ہے
محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

کہیں زیر دستوں کو راحت نہیں ہے
نہ زیرِ فلک ہے نہ زیرِ زمیں ہے

قدم اُس کے چوموں - جو اتنا بتا دے
ترا سنگِ در ہے، کہ میری جبیں ہے

جزا و سزا نیتوں پہ ہے زاہد
مجھے بھی یقیں ہے تجھے بھی یقیں ہے

گلوں کا تبسم عنادل کا نغمہ
بہار آفریں ہے کہ درد آفریں ہے

ہم بھی چُپ رہے

اُس شوخ نے نگاہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے
ہم نے بھی آہ آہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

آیا نہ اُن کو عہدِ ملاقات کا لحاظ
ہم نے بھی کوئی چاہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

دیکھا کئے ہماری طرف بزمِ غیر میں
تجدیدِ رسم و راہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

تھا زندگی سے بڑھ کے ہمیں وضع کا خیال
جب عمر نے نباہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

خاموش ہو گئیں جو امنگیں شباب کی
پھر جرأتِ گناہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

مغرور تھا کمالِ سخن پر بہت حفیظ
ہم نے بھی واہ واہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

۱

دیکھ رہا ہوں خدا کو میں

سمجھا ہوا ہوں شوخیٔ دستِ دعا کو میں
کچھ روز اور دیکھ رہا ہوں خدا کو میں

ثابت قدم رہوں کہ تلاطم کا ساتھ دوں
ساحل کے رخ تو لا نہ سکوں گا ہوا کو میں

کشتی خدا پہ چھوڑ کے بیٹھا ہے مطمئن
دریا میں پھینک دوں نہ کہیں ناخدا کو میں

انسان ہوں خطا سے وفا بخش دیجئے
بس کیجئے پہنچ تو چکا ہوں سزا کو میں

مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں
بیٹھا رہا لیے ہوئے دامِ وفا کو میں

نہ مرنا نہ جینا

ابھی چاہتا ہوں بہت روز جینا
بہارِ آفرینا خزاں آفرینا!

عبادت کی لذّت نہ جی بھر کے پینا
یہ کیا زندگی ہے نہ مرنا نہ جینا

مجھے یاد ہے اپنا انجام ناصح
مَیں اک روز مر جاؤں گا بس یہی نا!

تنزّل کی حد دیکھنا چاہتا ہوں
کہ شاید وہیں ہو ترقی کا زینا

مرے ڈوب جانے کا باعث تو پوچھو
کنارے سے ٹکرا گیا تھا سفینہ

۱

لیکن آج کیا کروں

کل ضرور آؤ گے، لیکن آج کیا کروں بڑھ رہا ہے قلب کا اختلاج کیا کروں
کیا کروں کوئی نہیں احتیاج دوست کو اور مجھ کو دوست کی احتیاج کیا کروں
اب وہ فکر مند ہیں کہہ دیا طبیب نے عشق ہے جنوں نہیں ہے علاج کیا کروں
غیرتِ رقیب کا شکوہ کر رہے ہو تم اس معاملے میں سخت ہے مزاج کیا کروں
ماسوائے عاشقی اور کچھ کیا بھی ہو سوجھتا ہی کچھ نہیں کام کاج کیا کروں
محوِ کارِ دیں ہوں میں بوریا نشیں ہوں میں راہزن نہیں ہوں میں تخت و تاج کیا کروں

زور اور زر بغیر عشق کیا کروں حفیظ
چل گیا ہے ملک میں یہ رواج کیا کروں

اگر خدا نہ ملا

ملا بھی درد بھرا دل تو کیا، ملا نہ ملا ترس کے عمر کٹی درد آشنا نہ ملا
اٹھو صنم کدے والو تلاش لازم ہے ادھر ہی لوٹ پڑیں گے اگر خدا نہ ملا
کرم کیا دلِ بے مدعا دیا تو نے ترے کرم کا مگر کوئی مدعا نہ ملا
تمام زادِ سفر راستے میں لٹ جانا خدا نے فضل کیا کوئی رہنما نہ ملا
رسن کو توڑ کے بھاگے ہیں قیدیانِ بلا وفا تلاش میں نکلی کہیں پتا نہ ملا
بتوں نے عشق دیا، وہ بھی لاعلاج مرض خدا سے درد بھی مانگا تو لا دوا نہ ملا

برنگِ شعلہ اڑا ہے مرے شباب کا رنگ
شرابِ تند ملی تھی مگر مزا نہ ملا

اپنے ہُنر کو کیا کروں

اُن کو جگر کی جستجو، اُن کی نظر کو کیا کروں
مجھ کو نظر کی آرزو اپنے جگر کو کیا کروں

رات ہی رات میں تمام ہو گئے عُمر کے مقام
ہو گئی زندگی کی شام اب میں سحر کو کیا کروں

وحشتِ دل فزوں تو ہے حال مرا زبوں تو ہے
عشق نہیں جنوں تو ہے اس کے اثر کو کیا کروں

فرش سے مطمئن نہیں پست ہے ناپسند ہے
عرش بہت بلند ہے ذوقِ نظر کو کیا کروں

ہائے کوئی دوا کرو، ہائے کوئی دُعا کرو
ہائے جگر میں درد ہے، ہائے جگر کو کیا کروں

اہلِ نظر کوئی نہیں، اِس لئے خود پسند ہوں
آپ ہی دیکھتا ہوں میں اپنے ہُنر کو کیا کروں

ترکِ تعلقات پر گر گئی برقِ التفات
راہگذر میں مل گئے، راہگذر کو کیا کروں

زمین و آسماں والے نے مارا

حیاتِ جاوداں والے نے مارا
زباں دے کر زباں والے نے مارا

بشر کو اس قفس میں تنگ کر کے
زمین و آسماں والے نے مارا

نگاہیں کام دیتی ہیں نہ راہیں
مکاں و لامکاں والے نے مارا

گوارا ہے دوامی تلخ کامی
کسی میٹھی زباں والے نے مارا

نصیحت گر کو سمجھاؤ خدارا
کہ اس سود و زیاں والے نے مارا

کوئی حد بھی ہے تسلیم و رضا کی
مسلسل امتحاں والے نے مارا

وہ دل میں ہے دل آنکھوں میں نہاں ہے
نشاں دے کر نشاں والے نے مارا

سوئے منزل لیے جاتا ہے ظالم
ہمیں اس کارواں والے نے مارا

ہمیشہ کے لئے خاموش ہو کر
نئی طرزِ فغاں والے نے مارا

مجھے کہنا پڑے گا
متاعِ دو جہاں والے نے مارا

یہ مال پُرانا ہے

چاند اور ستاروں کا یہ سماں کیا دلکش اور سہانا ہے
افسوس مجھے نیند آئی ہے افسوس مجھے سو جانا ہے

اک رند مجھے اس کوچے میں ناصح کہ لے کر جانا ہے
کچھ دل کو راہ پہ لانا ہے کچھ دلبر کو سمجھانا ہے

معصوم امنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولوں میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہے

دل شیشہ بنے پیمانہ بنے ہم دل کی حقیقت جانتے ہیں
بے رنگ سا اک قطرہ ہے جسے آنسو بن کر بہ جانا ہے

بازار نیا گاہک بھی نئے اب جنس وفا کی قدر نہیں
بے سود نمائش رہنے دے اے دل یہ مال پُرانا ہے

اے طائرِ جاں کچھ روز ابھی اڑنے کی ہوس میں رہنا ہے
اس تنگ قفس میں رہنا ہے دکھ سہنا ہے غم کھانا ہے

پروانہ پروانوں کا

جب سے دیکھا ہے جل مرنا ننھی ننھی جانوں کا
شمع کا پروانہ نہ سہی پروانہ ہوں پروانوں کا

یہ دامن ہے یہ ہے گریباں آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

سر کر سرافرازی دے کر سجدوں پر مامور کیا
سر دے کر بھی ہو نہ سکے گا بدلہ ان احسانوں کا

محشر والوں نے بھی مجھ کو شاعر کہہ کر چھوڑ دیا
میری سند عمل کو سمجھے مجموعہ افسانوں کا

ایسی جنس سند اہم کر لی جس کا گاہک کوئی نہیں
لادے لادے پھرتا ہوں اب پشتارا ارمانوں کا

لے چل ہاں منجدھار میں لے چل ساحل ساحل کیا چلنا
میری اتنی فکر نہ کر میں خوگر ہوں طوفانوں کا

بیڑا پار لگانے والے میرا منہ کیوں تکتا ہے
میں تو ساحل پہ رہ کر بھی خوگر تھا طوفانوں کا

۱

پستیاں

کیا ہو گئیں وہ عہدِ فراغت کی مستیاں
وہ دوستوں کی بزم وہ بادہ پرستیاں

آخر شکست کھا کے گرا پہلوانِ شوق
افکار کی چلیں وہ زبردست دستیاں

پیاروں کی موت نے مری دُنیا اُجاڑ دی
یاروں نے دُور جا کے بسائی ہیں بستیاں

جن سے خیال میں بھی جدائی نہ تھی پسند
وہ خواب ہو گئے ہیں خیالوں کی ہستیاں

لوٹے پڑے ہیں آج قرابے شراب کے
کیا جلد اُتر گئیں مرے نشّوں کی مستیاں

کب تک نہیں گے بہرِ دعا دستِ التجا
آخر بلند ہو کے رہیں گی یہ پستیاں

بقلم خود

فنون کے تازہ ترین ایڈیشن میں پچاس پچپن برس پیشتر اپنے وطن جالندھر کے خالص پنجابی معاشرے کا حال بیان کر چکا ہوں جس میں اردو زبان پر اپنے مرمٹنے کی مشق مبتدیانہ کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے

آج سوز و ساز میں حسب وعدہ "یہ کہنا ہے کہ جب میں گیارہ بارہ برس کی عمر سے اکیس برس تک کی مشق غزل جھولی میں ڈالے دیہاتی قصباتی مشاعروں میں بڑے بوڑھے پنجابیوں سے واہ بھئی منڈیا واہ (واہ رے لڑکے) سنتا اور دل ہی کے پھول چنتا ہوا اپنی غلط روی سے اس دور کے شہر سخن لاہور میں داخل ہوا تو بہ ہمہ پکڑے جانے و زدیجو کا شور اٹھا اس لئے کہ میرے کان میں کسی استاد یا جانشین استاد کی غلامی کا حلقہ نہ تھا معزز و معتقد نہ تھی۔ لکھنؤ سخنوری کے ایک عام شہری کا حق حاصل کرنے کے لئے جو جنگ دو دو بہ مجھے کرنی پڑی۔ اگر میں بہ ہوش و حواس ذرا فرصت سے زندہ رہا تو اپنی حیات خود نوشت میں لکھنے کی تمنا رکھتا ہوں۔ یہاں صرف اس پس منظر کی ایک جھلک دکھا رہا ہوں جس سے میری موت کے بعد میرے فن پر حکم لگانے والے بالغ نظر نقادان فن محض قیاس اور ظن سے کام لینے کی مصیبت سے بچ جائیں گے۔

بہت سے شاہدان عادل تو چل بسے ـــ باقی میری طرح پا بہ رکاب ہیں۔ میرے دور شعر کے چشم دید واقعات کون بیان کرے گا۔ کس کو فرصت ملے گی ـــ لہٰذا اپنی صلیب آپ ہی اٹھا رہا ہوں۔

انتہائی طور پر مختصر چند متعین صفحوں کے اندر محدود لفظوں، لکیروں، سطروں کے ناپ تول گنتی شمار کے ساتھ آپ بیتی لکھنا کوئی آسان بات نہیں بالخصوص اپنے ہمعصروں کی زندگی میں خود زندہ رہتے ہوئے۔ ایسی باتیں لکھنا بہت مشکل ہیں۔ جن میں دوسروں کے مقابل اپنی کامیابی کا پہلو بھی نمایاں ہو ـــــ!

میں کہ اکثر و بیشتر نظم ہی کے ذریعے اظہار خیال کرتا رہا۔ یہاں ایسے واقعات کی طرف نثر کے ذریعے اشارے کر رہا ہوں جن کا تعلق شاعرانہ تخیلات و تصورات کی کہانی سناتے وقت ایسے افراد سے ہے جن کے حسیات دوسرے انسانوں سے زیادہ ذکی ہیں اور جن کے مزاج کی شگفتگی کے

پیش نظر معصوم سی معصوم لغزشِ قلم سے بھی انتہائی احتیاط لازم ہے۔

سخنوری کے چوگان میں جتھا بندی، صف آرائی، سازش، حیلہ و ترکیب۔ اکھاڑ پچھاڑ افسانہ نہیں حقیقت ہیں۔ میں نے شاعروں کی نبرد آرائی اور ایک دوسرے کے خلاف لام بندی کے قصے آزاد کی "آبِ حیات" میں پڑھ رکھے تھے لیکن یہ گمان تک نہ تھا کہ اپنی آنکھوں سے نہ صرف یہ دنگل دیکھوں گا بلکہ "ہل من مبارز" کہنے والے مجھے بھی گھسیٹ لیں گے۔ میں نے شعر و شاعری کو دل لگی سمجھا تھا لیکن یہ دل کی لگی بن گئی۔ بڑی سخت پٹائی کے بعد "مار کھائی حکمت آئی" پر چلا کہ سیاسی، مذہبی، ملکی، ملی معاملات پر جدال و قتال کی خاطر میدان میں اترنے والے قسمت آزماؤں کی نسبت زبان و بیان کے لندھور بن سعدان فتح و شکست کے بارے میں بہت زیادہ سریع الحس ہیں۔ ایسا کیوں ہے یہ "سائیکالوجی" والے جانیں لیکن ایسا ہے ——!

اور مجھے —— جو ادب کو ملحوظ رکھنا ہے میری زندگی کا کھیل ابھی الجھا ہوا ہے۔ مجھے اس بڑھاپے میں "نو لکھوں" کے دھوبی پٹڑوں سے بھی نپٹنا ہے ؎

وہ اور تھے جو شرط کر کے کھیل جان کر کھیلے بھی اور چل بھی دیئے جیت ہار کے

کھیلنا ہی نہیں۔ کھیلتے چلے جانے کے ساتھ کھیلی ہوئی بازیوں کا حساب بھی چکانا ہے۔ اپنے مربیوں کا شکر اپنے مقابل معرکہ آراؤں کا ذکر، ان کا بھی جو تشریف لے جا چکے اور ان کا بھی جو قطعاً استاد ہو چکے ہیں اور اپنے بچوں کو بگاڑنے کے داؤ پیچ بتا رہے ہیں۔

لیکن یہ سب کچھ ان صفحات میں نہیں سما سکتا۔ اس کے لئے آپ کو میری درازیٔ عمر کی دعا کرنی پڑے گی۔ یہاں تو چند مختصر باتوں کے بعد مختصر ہو جاؤں گا۔

شب فراق کے لئے چھوڑی ہوئی یہ داستان گذشتہ سے یوں پیوستہ ہے۔ کہ میں سنہ ۱۹۴۷ء میں لاہور میں نو قیام کیلئے آیا تھا۔ سخنوری اور شاعری کے لئے۔ مجھے تو اس غارت گر کے ہاتھوں پنڈل کی آہیں، ناکارہ بیگانوں کی نگاہیں آوارہ قرار دے چکی تھیں۔ اپنی املاک اور جمع جتھا کو میری دست برد سے محفوظ رکھنے کے لئے شاعری پر کار بیکاراں کی تہمت رکھ کر گھر والوں نے مجھے جالندھر سے نکال دیا تھا۔ لاہور میری بیوی کا میکا تھا۔ میری اور شبیر خاں جی کو چند روز ان کے سر ڈال کر اپنی تعلیم کے بل پر کہیں دور ریل کی دیہاتی پٹری پر ایک چھپا ٹھکانہ ڈھونڈ کرنے کی نوکری ڈھونڈنے کا ارادہ تھا۔ ایک چھوٹے سے کوٹھے کو "رز" پر قناعت کر لیتا۔ ایک بکری دو تین مرغیاں پال لیتا۔ سارا دن بکائن، نیم یا شیشم کی چھاؤں تلے مونج کی چارپائی پر بیٹھے لیٹے حقے سے بدنی کا دم بھرتا نظر آتا ہیں، وہ گذرے ہم "کا ورد" اور آیا کہ واڈھر ہی مری بساں کبھی کبھی کے تتبع میں فکر سخن کرتا

یہ تھی دھن ———

مگر پہلی ہی لب کشائی پر ——— زادہ چھا گیا۔ کی استادانہ داد اور پھر ہر تیسرے چوتھے دن کسی نہ کسی کالج کے مشاعرے کبھی کنسرٹ کی واہ واہ نے ایسا نشہ چڑھا دیا کہ ریل کی پٹری۔ پھاٹک۔ بکری۔ مرغیاں۔ بکائن نیم اور شیشم تلے موچ کی چارپائی ساتھ ہی حقہ وقت بے وقت بار بند دال یونہی جلتی رہ گیا۔ والدین کا نالائق بیٹا ثابت ہو ہی چکا تھا۔ اب سسرال کا نکھٹو داماد بننے ہی والا تھا کہ میری شرم و دستگیری کی نوشتہ تقدیر نے لاج رکھ لی جس شاعری نے مشکل میں ڈالا تھا۔ اسی کو مشکل کشائی کا حکم ملا ——— ایک نعتیہ مشاعرہ اندرون بھاٹی دروازہ زیر صدارت خان احمد حسین خان (مشہور ناولسٹ) مالک و مدیر "شباب اردو" منعقد ہوا۔ مصرع طرح پر میری سادی سی نعت کچھ زیادہ ہی پسند کی گئی۔ اور میں ساٹھ روپے ماہوار کے "وعدے" پر دوسرے روز شباب اردو کا نائب مدیر بن گیا۔ وعدہ اس لئے لکھا گیا ہے کہ یہ وعدہ ہی تھا ——— !

یہ خبر سسرال آکر میں نے اس طرح سنائی جیسے پنجاب کا لفٹننٹ گورنر بن گیا ہوں۔

اب ہر صبح آٹھ بجے انار کلی سے پیدل چلتا مسجد شاہ محمد غوث کے مقابل بالاخانے "شباب اردو" کے دفتر پہنچتا۔ صبح نو سے چار پانچ بجے تک مسودوں کی اصلاح بلکہ از سر نو تشکیل و تکمیل۔ کتابت اور پروفوں کی تصحیح کے علاوہ خریداروں کے پتے بھی چٹوں پر لکھتا۔ خاں صاحب کوئی مصرع دیتے غزل کہہ دیتا۔ کوئی موضوع بتاتے مضمون دھر گھسیٹتا۔ میری یہ تحریریں شباب اردو کے صفحوں پر کسی ایسے خریدار کے نام سے شائع ہوتیں۔ جو اپنا نام شاعر یا مضمون نگار کی صورت میں دیکھنے کے لئے "خان صاحب" کو کچھ نقد نذرانہ پیش کر چکے ہوتے۔ میرا کام یہ بھی تھا کہ بہت سے ترقی خواہوں کو وحشتا بنا دیا کروں۔ شباب اردو کے رنگین ٹائیٹل پر اپنا نام نائب ایڈیٹر دیکھ کر پھولا نہ سماتا۔

ان دنوں دوپہر کو بھوک بھی لگتی تھی سامنے "کبابی" تھا۔ ایک آنے کا نان ایک آنے کے دو کباب۔ ہوٹل پیادہ کا نہ اشتہاں کے زوال میں سینچا ہوا۔ اور دفتر کے پچھواڑے لگے ہوئے گھڑے کا پانی دونوں مفت۔ "ریڈ لیمپ" سگریٹ ایک پیسے میں چھ ملتے تھے۔ چار پانچ بجے یہاں سے نکلتا پنڈت ہری چند سے ملنے مشن کالج کے مولچند ہوسٹل پہنچتا۔ پنڈت نہ ہوتا تو اس کے بند کمرے کے سامنے ایک بے اودائی جھنجلے میں جھولتا دو چار شعر ایک آدھ غزل برآمد کر لیتا۔ پنڈت کا ایک دوست ویوی دیال جو گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ ڈیمانسٹریٹر تھا۔ آ جاتا۔ کھوسٹ بھی دوسرے تیسرے مل جاتا ہم کبھی انار کلی کبھی مال روڈ کبھی اندرون شہر سیر گشت کیا کرتے۔ کھوسٹ لوگوں کو چھیڑ کر ہمیں بھی گالیاں کھلواتا ہم قہقہے لگاتے بھاگ نکلتے۔ حالانکہ ہر کسا اور بھی چند پرانے یار دوست۔ سب کالجوں میں آ چکے تھے۔ فاخر لدھیانوی۔ ارشاد احمد خاں۔ عطاء الرحمن۔ ممتاز ——— سے

شاگردانِ رشید بنے ہوئے تھے۔ صاحبزادہ ابو نعیم عبدالحکیم نشتر اس وقت بھی ایک پختہ شاعر اور ناقد تھے۔ منٹگمری سے انگریزوں کی انڈر پڑھائی ختم کر کے اب تصنیف و تالیف کے شعبوں کو تنقید اور اصلاح سے فیضیاب کرنے کے لئے یہاں وارد تھے۔ مرتضیٰ احمد خاں میکش بھی یہاں اعلیٰ تعلیم کے لئے موجود تھے۔ ان کے توسل سے مولانا غلام رسول مہر سے تعارف ہو گیا جو حضرت مولانا ظفر علی خاں اور سالک صاحب کے قید فرنگ میں چلے جانے کے بعد سے زمیندار کے مدیر اعلیٰ تھے۔

حکیم فقیر محمد چشتی جو اگرچہ تھے تو پنجابی لیکن دہلی کی اردو اور اس کی بگاڑ پر استادانہ عبور رکھتے تھے۔ مجھ پر نہ جانے کیوں شفقت فرمانے لگے۔ حکیم احمد شجاع صاحب سے بھی ان ہی دنوں نیاز حاصل ہوا۔ ساتھ ہی مولانا تہابا سے بھی جو قدیم ہونے مگر فن میں اس زمانے کے جن تھے۔ حکیم صاحب نے ہزار داستان اور نونہال کے علاوہ دار الاشاعت ادب لطیف قائم فرما کر افسانہ و ادب کا ایک بلند معیار قائم کر رکھا تھا۔ مولانا تہابا ان سے منسلک تھے۔ سید عابد علی عابد سے بھی ان ہی دنوں شناسائی ہوئی۔ وہ مجھے شباب کے دفتر میں اپنا لکھا ہوا تازہ طبع شدہ اور اپنے تبصرہ عطا فرمانے آئے تھے۔ قبول صورت اور شگفتہ مزاج تھے۔ منشی فاضل کا مرحلہ طے کر کے آگے بڑھ رہے تھے۔ اثر صہبائی صاحب کا تعارف بھی ان ہی دنوں مشاعروں میں ہوا جو شاید کالج کے طالب علم تھے۔

علامہ اقبال کے حضور تو حضرت گرامی کے سبب پہلے ہی سے باریابی تھی۔ جناب عبدالرحمٰن چغتائی سے بھی پہلے کا نیاز حاصل تھا۔ البتہ شیخ عبدالقادر صاحب سے رسم نیاز مندی ایک مشاعرے میں ہوئی جو ایس پی ایس کے ہال میں شیخ صاحب کی صدارت میں انجمن ارباب علم کی جانب سے برپا ہوا کرتا تھا جس میں حضرت علامہ اقبال کے سوا سب نامی نامور شعرا شریک ہوتے تھے۔ یہ انجمن مولانا (جو علامہ کہلاتے تھے) تاجور نجیب آبادی کے دامن سے وابستہ اور ایسے اہل زبان شعرا اور ان کے چند بے زبان پنجابی ہندو و مسلمان اور سکھ شاگردوں اور چند سخن سازی و ادب نوازی کرنے والوں پر مشتمل تھی۔ جسٹس شیخ عبدالقادر کا نام نامی اردو کے مبلغ اعظم ہونے کی وجہ سے بطور صدر استعمال ہوتا تھا۔ اس لئے متعدد حکام اور اہل ثروت ہر لحاظ سے بڑے آدمی سب اس کے سرپرست تھے بلکہ تعلیم کے افسروں کے ذریعے کتب فروشی کرنے والوں کی بھی مدد حاصل تھی۔ لہٰذا لاہور میں بجنوری استادی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ پنجاب کے اردو لکھنے والے حوصلہ افزائی کے لیے انجمن کے محتاج تھے۔ اس کے مشاعروں میں مجھے بھی حاضری کی دعوت ملی۔ اور میں کیوں حاضر نہ ہوتا۔ انجمن ارباب علم ایک خانہ باغ تھا جو رنگارنگ کے بڑے چھوٹے گملوں کے اندر کاشتہ پودوں سے پُربہار تھا جس کو مولانا تاجور بطور رہنمائی اور ان کے لگے بندھے نائب مالیوں کی صورت میں سینچتے اور کانٹ چھانٹ کے ساتھ دیدہ زیب نظر فریب بنائے رکھتے تھے۔ لاہور میں آئے ہوئے اہل زبان اور پنجابی بے زبان حوصلہ افزائی اور سخن سرائی کے لئے مولانا اور ان کے جتھے کے محتاج تھے۔

بس ایک میں تھا۔ کہ اپنی حوصلہ افزائی آپ خود ہی کر رہا تھا۔ میری صورت حال یہ تھی کہ میں کسی گنتی میں نہیں۔ ایک کنارے خالی زمین پر بس یونہی خود بخود اُگ آیا تھا۔ اُگ ہی نہیں آیا تھا پھیل بھی رہا تھا۔ لہٰذا گملوں میں پھوٹنے والے پودوں کو میری چھاؤں سے بچانے کے لئے مجھے اکھاڑ پھینکنا لازم کر دیا گیا۔ یہ اکھاڑ پچھاڑ مشاعروں سے نکل کر اخباروں، حکومت اور کونسلوں تک پہنچی ہینڈ بل بانٹے، اور اس کے ثبوت آج موجود نہیں ہیں۔ اور جو تیں وفاداریاں بچا کر ماتھے چلا کر تھک چکے ہیں لیکن میرا سمندِ شوق اگرچہ درماندۂ تشنہ تھا ان کے تازیانہ ہائے ناز ناتواں سے ممنونِ احسان ہے اور رہے گا۔ یہ اکھاڑ پھینکنے، کاٹ ڈالنے کی کوششیں ہی تھیں جن کے خوف نے مجھے اپنے تیشے سے ناتراشیدہ کندہ کو بنانے سنوارنے پر آمادہ اور بتائید کرم اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کا دلدادہ بنا دیا۔

میرا ان سے کوئی ذاتی جھگڑا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ عالم، فاضل، ایڈیٹر، پروفیسر، وکیل، وکلا، حقیقت بند ادبیں بھی مردانِ معتبر — میں تھا ہی کیا سوائے اس کے کہ ایک جماعت سے بھاگا ہوا ایک منحنی کمزور سوکھا سا کھا بے حیثیت نیم وارد پنجابی۔ تو باقی میری شعر گوئی، غزل خوانی کی لن ترانی محبوبیت کی نشانی تھی۔ میرا خیال ہے اگر میرا نوٹس نہ لیا جاتا تو میں وہیں رہ جاتا لیکن میری طفلانہ طرزِ سخن کی قبولیت دیکھ کر اربابِ علم والوں میں غور و فکر کی ضرورت پڑ گئی تھی میری سب سے بڑی نالائقی اور کمزوری یہ گردانی گئی تھی کہ میں اردو کے کہنہ مشق استادوں میں سے کسی کی شاگردی یا توسل کے بغیر ہی شاعر بنتا چلا جا رہا تھا۔ شاعر یا متشاعر بن جانا کوئی بڑی بات نہ ہوتی مشکل یہ آ پڑی تھی کہ مشاعروں میں میری مانگ بڑھ رہی تھی اور یہ بات اندیشہ ناک تھی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا مشاعرے ان کی نظروں میں مقتدر لوگوں کو جمع کرنے اور ان کے توسل سے مختلف فوائد کے لئے آگے بڑھنے اور اپنے چہیتے سدھوں کو آگے بڑھانے کے ذرائع تھے۔ شعر و فن کا باہمی موازنہ اور ان سے فن ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی یا اصلاح غیر ضروری تھی مشاعروں کے تذکرے پر میں سمجھتا ہوں میں خود بھی تو منبس ہی رہا ہوں۔ لیکن ان دنوں اظہارِ فن کا دوسرا کوئی میدان نہ تھا بھی تو نہیں میں پرانے دور کے لاہور کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ آج آپ نے شاید کوئی اور صورت پیدا کر لی ہو۔

مجھے اربابِ علم کا وہ مشاعرہ کبھی نہ بھولے گا جس میں میں نے پہلی مرتبہ شامل ہوا اور پہلی مرتبہ یہاں اپنا کلام ترنم سے سنایا۔ ورنہ اب تک تحت اللفظ ہی پڑھتا تھا۔ بات یوں ہوئی کہ حاضرینِ مجلس سے جب اسٹیج پر آنے والے ہر شاعر کو سر سے قدم تک (یہ پر تشدد یہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے) کی تک شگاف نعرے بلند کئے جا رہے تھے اور جب وہ بے چارہ تعمیلِ ارشاد کرتا تو اس کی گت بن جاتی تھی۔ اپنی باری آتی دیکھ کر میں نے سوچا تاکہ دل سے پوچھا کیا کیا جائے۔ دل نے کہا میاں تم حوصلہ ہار بیٹھے۔ جس دھن میں شعر کہتے وقت گنگنایا کرتے ہو اسی دھن سے سنا بھی دو —

باری بھی جلد ہی آگئی اور حفیظ کی شعر خوانی کو دل کی سازش نے ترنم سے وابستہ کر دیا۔ واقعی حوصلہ کیا۔ ایک تازہ غزل ترنم سے سنا ڈالی۔ مجھے خود بھی اپنی آواز بھلی معلوم ہوئی۔ ایک اور، ایک اور کی تعمیل کرنی پڑی ——

آج سے قبل شیخ عبدالقادر ہمیشہ کے لیے میرے مربی و محسن بننے کے لیے اور ارباب علم وفضل میرے ارباب نشاط میں سے ہونے کا اشتہار دیتے رہنے کے لیے نکلے ——

سسرال نے مجھے دو ماہ بعد گھر سے نکال دیا تھا اس لیے کہ شباب اردو کا مالک مجھے ساٹھ روپے تنخواہ ادا کرنے کا وعدہ جبرل گیا تھا۔ اور میں نے اپنی بیوی بچی تو کیا خود اپنے اخراجات خورد و نوش کے لیے سسرال میں کچھ ادا کرنے کی چنداں ضرورت نہ جانی تھی۔ لہذا ایک شام میرا بستر، چند کتابیں، ایک ہارمونیم باجا، ایک مصلے، ایک ٹین کا ٹرنک گلی میں پڑے تھے۔ میں نے کھوسٹ کی معرفت دھوبی منڈی پرانی انارکلی میں پانچ روپے ماہوار پر ایک چوبارہ لیا۔ بچی کو دیکھنے اور بیوی سے ملنے اندھیرے سویرے سسرال جانا ضرور تھا لیکن یوں شتر بے مہار ہو گیا تھا۔ دیوی دیال اور کھوسٹ اپنے اپنے ہوسٹل سے میرے ہاں اٹھ آئے۔ میری چنڈکی بیٹھک بھی یہیں بن گئی۔ بہت سے اور نوجوان کالجی میرے ہاں جمع رہتے۔ اس بالاخانے سے بھی تیسرے ہی مہینے نکلنا پڑا۔ نیچے نکڑ پہ ماسٹر چھیدی لعل کے ساتھ "لاہی پیچھڑے کی" دکان تھی۔ کھوسٹ کی اس سے (جانے کب کی) جان پہچان تھی۔ لاہی پر کوکین کا شک ہوا۔ پولیس میں طلب کیا گیا۔ کچھ دے دلا کر وہ تو اپنے پیچھڑے پن کی دکان پر آ گیا۔ لیکن ہم ڈر کے مارے بالاخانہ چھوڑ گئے۔

اب یونیورسٹی گراؤنڈ کے سامنے گنگا رام بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں جا بسے۔ دیوی دیال میرا ہانڈی وال، کھوسٹ مستقل مہمان اور میری چند ہماری گزشت خوری کا نگران۔ میرے جالندھر کے بکے ہوئے مکان کی قیمت ڈاک خانے میں جمع تھی۔ والد سے یا والدہ سے مدد مانگنا میرے رانگڑپن کے خلاف تھا۔ اس طرح سے خود شکم و مبدم تا نفتی کے مزے لیتا ——

شباب اردو کے خاں صاحب نے دو تین مہینے کے پیسے تو حساب دوستاں در دل فرما دیئے۔ لیکن آئندہ کے لیے دو دو روپے روز پہ معاملہ تقریباً ایک سال تک چلتا رہا۔ ایڈیٹر بنے رہنے کی خوشی میں ہم بھی مگن رہے۔ یہ دو دو روپے بھی ہر اتوار اور بیوی آرائی خاں صاحب کے چھٹی منا لینے پر چھٹی اور تیوہار پر تیوہار منا لیتے پر مارے جاتے۔ دوست تو بہت تھے لیکن ان سے کچھ مانگ سکنے کی بات اور، دونوں معلوم نہ تھی۔ کیا کرتا، میں نے لاہور کے چند تعلیمی کتب فروش اداروں اور رسالوں کے لیے مضمون نظم میں اور درسی کتب کے لیے سبق لکھ دینے کی مشق کی اور یہی دھندا اختیار کر لیا۔ میرا سب لکھا ہوا تاجران کتب یا ان کے دیئے ہوئے ناموں سے شائع ہوتا۔ مجھے بھی بائد گمنامی کے سوا اس پر بلانے۔ یہ میں کما دُ ثابت ہونے

کے لئے اپنی والدہ اور بیوی کو جو جالندھر چلی گئی تھی پہنچا دیتا۔ خود شباب کی ڈیوڑھی پر گذر کرتا۔

دوسرے سال شباب سے مفارقت ہو گئی۔ وجہ یہ ہوئی کہ مرتضیٰ احمد خان میکش اور ان کے ایک دوست ڈاکٹر ابراہیم اور میں نیاز ہوسٹل اسلامیہ کالج میں بیٹھے شعر بازی کر رہے تھے۔ یہ ایک چودھری محمد علی (جو ان دنوں ایف اے بی۔ ایس سی کر چکے تھے۔ پاکستان کے سیکرٹری جنرل وزیر خزانہ اور وزیر اعظم بھی رہ چکے ہیں) کے تفنن طبع سے دو چار ہوئے تو دوسرے ہی دن ہم کشمیر کی سیاحت کو چل نکلے جیسے جیبوں کے پاس مجموعی طور پر ڈیڑھ سو سے زیادہ رقم نہ تھی۔ دو مہینے کی یادگار "نخل فروش" کے بعد پہنچے تو خان صاحب نے میرے وہ دو روپے دھائی بھی بند کر دئیے۔ دوسری قلمی مزدوری ملنے کے لئے بھی تمام وقت پر کرنے کا یقین دلانے والا نہ رہا۔

سالک صاحب جو قید فرنگ میں تھے رہا ہو کر اب مہر صاحب کے ساتھ زمیندار کے شریک دورت تھے۔ مجھے پینتیس روپے ماہوار پر (پارٹ ٹائم) لڑکوں کے جیسے جو سیدنا سیدات کی اصلاح اور کاپیاں پڑھنے کے لئے "پارٹ ٹائم" کام مل گیا جو دو ماہ رہی۔ "پارٹ ٹائم" ہی رسالہ تبلیغ میں بھی ان ہی دنوں کام کیا۔

کشمیر کی اس سیاحت کے بعد خیالات کے ساتھ حالات بھی بہت نازک اور تنگ ہو گئے تھے۔ البتہ میرے شوق فضول کی بڑھتی ہوئی مانگ ترقی پذیر تھی۔ مشاعروں کے علاوہ اب لاہور ہی میں نہیں دوسرے شہروں کی اسلامی انجمنوں کے جلسوں میں بھی چندہ جمع کرنے کے لئے حفیظ جالندھری اچھا خاصا ذریعہ تھا۔ بڑی دوڑ دھوپ کا زمانہ تھا لیکن نہ مشاعروں کے کٹش کی فرصت میں نہ انجمنوں کے چندے میں کہیں بھی میرا حصہ بجز ان کے تھا۔ مجھے خبر ہی نہ تھی کہ یہ بھی ہوتا ہے زمانے میں۔

اب بجائے ایک کے دو بیٹیوں کا باپ بن چکا تھا۔ بیوی جس کو زچگی کے لئے میری والدہ جالندھر لے گئی تھیں چند مہینے کے بعد زچہ بچہ کو لے کر لاہور واپس آ گئی۔ میں نے موری دروازے کے اندر لاہور کی شاہ نور شاہی بدرو کے کنارے دوسری منزل پر ایک مکان کرایہ پر لیا، جس میں چار پائیوں پر ہم چاروں بمشکل سما سکتے تھے۔ البتہ کپڑوں کا ٹرنک رہتا۔ اس لئے ان چار پائیوں کے نیچے کبھی سوچی ہوئی بے ترتیبی کے ساتھ سما گیا تھا۔ ملنے جلنے والے شعر لکھنے لکھوانے والے میرے شکار اور شکاری آتے تو سامنے بدرو کے اس پار رونق ہوئی لگا اس پر کر بیٹھ جاتا۔ اہل علم اور کالجوں کے مشاعرے اسلامی جلسے میرے بغیر کم ہی منعقد ہوتے تھے۔ مشاعروں میں اگرچہ میرے شانات مخالف بھی ہیں ہیچ کہیں جاتا میری غزل سن کا جواب دینے کے لئے ان دنوں محض مرتال والوں کو خاص طور پر لایا جاتا تھا۔ میری غزل کے بارے میں مشہور کیا جاتا کسی استاد کا کلام اڑا لیا

اخباروں میں مشاعروں کی روداد میں مجھے "دوم میراثی" لکھا جاتا میں جلتا لیکن شیخ عبدالقادر دلجوئی کرتے اور میں اظہارِ خیالات و جذبات کی رنگارنگی میں دل اور زبان کی ہم آہنگی پر محنت کرتا رہتا۔ ہر مشاعرے کے آغاز پر میرا دل زور زور سے دھڑکتا لیکن کرنا خدا کا یہ ہوتا کہ عام سامعین کا ذوق آوازہ کسنے والوں پر غالب رہتا۔ میں تحسین کے پھولوں سے لدا ہوا نکلتا۔ یہ پھول سیج کے لئے کام نہ آتے۔ بیوی کے لئے موتیے کے پھول خریدنے کی اُن دنوں توفیق کہاں تھی۔ بیوی اپنا زیور بھی میری والدہ ہی کے صندوق میں رکھ آئی تھی۔ کنبے کے اندر اس سلسلے میں میرا اعتبار شادی سے پہلے ہی اُٹھ چکا ہوا تھا۔

فکرِ شعر کے انہماک کے خاص دنوں میں ہنڈیا پکنے میں اکثر کچھ کسر رہتی۔ بسا اوقات ایک ہنڈی میں چھوٹی سی "تہمدی" باندھ ریلوے سٹیشن پر جاتا۔ کسی کے ہاتھ میں سوٹ کیس یا چھوٹا ٹرنک دیکھتا تو سہارے کے ساتھ اٹھا لیتا اور تانگے کے اڈے تک یا جہاں کہیں جانا ہوتا لے جاتا۔ باقاعدہ لائسنس والے قلیوں نے مجھے بارہا ڈانٹا۔ مار پیٹ کا بھی خوف رہتا۔ اس طرح دو چار پھیرے کرتا۔ اور اپنی دن کی آمدنی میں چونی دونی کا اضافہ فرما کر گھر پلٹتا۔ بیوی بچوں کو کھلا پلا اور سلا کر خود لکھنے بیٹھ جاتا۔ میری نظم "فرصت کی تلاش" ان ہی دنوں کی ہے۔ جو حضرت صاحب نے زمیندار کے پہلے صفحے پر شائع کر دی۔ اہلِ زبان نے لکھنؤ سے اسے بے تکی نظم کا عنوان عطا کیا اور اس کی پیروڈیاں لکھیں۔ اور لاہور میں پھبتیاں کسی جانے لگیں۔ ایک دن علامہ اقبال کے حضور میں تھا۔ حضرت لکھنؤ کے اودھ پنچ میں میری نظم اور اس کی پیروڈی پڑھ کر ہنسے فرمایا "جینئس پر ہمیشہ نکموں کے آوازے کسے جاتے رہے ہیں یہ دنیا کا چلن ہے۔" مجھے اس لفظ "جینئس" کے معنی معلوم نہ تھے تاہم جی بہت خوش ہوا کہ حضرت فرماتے ہیں تو کوئی اچھی بات ہی ہوگی۔

عجیب زمانہ تھا۔ ہندو مسلمان سکھ عیسائی سب الگ الگ اور مل جل کر ہر رنگ میں جوش و خروش میں تھے۔ ایک دیگ جس میں ہر جنس دانوں حلیم کی طرح مل جل کر پک رہی تھی اور ایک دوسرے کی خوشبو سے لت پت تھی اب ایک دوسری سے جدا ہونا چاہتی تھی۔ ساتھ ہی حکومت انگریزی کے خلاف تحریک عدم تعاون بھی زوروں پر تھی۔ اللہ اکبر، بندے ماترم اور ٹوڈی بچہ ہائے ہائے کے نعرے ہر چہار طرف سنے جاتے تھے۔

خلافت اور کانگریس کے جلسے ہوتے، گرفتاریاں، سزائیں آئے دن کا معمول تھیں۔ اخباروں کے ایڈیٹر دھڑا دھڑ گرفتار ہو رہے تھے۔ اخبار کے مالکوں نے "ڈمی" ایڈیٹر رکھنے شروع کر دیئے تھے۔ جن کو محض قید ہو جانے کے لئے پیسے دیئے جاتے تھے۔

میری فاقہ کشی کے پیشِ نظر اس سعادت کے لئے میرے سامنے بھی تجویز پیش ہوئی بلکہ شاید اس دور میں یہ بھی کر گزرتا لیکن اتفاقاً شیخ عبدالقادر نے مجھے ملاقات پر بلایا اور میرا ارادہ سن کر بڑی شفقت سے فرمایا "اپنا مقصود متعین کرو۔ تمہارا مقصود شاعری ہے یا سیاسیات" ادھر بیوی کی

پکار پر والدہ نے طعن و تشنیع کا خط اور پانسو روپیہ بھیجا کہ کوئی کام دھندا اختیار کروں۔ روپیہ میں نے غصے کے ساتھ پلٹ دیا لیکن بیوی کی کم فہمی سے اپنا محاسبہ کرنا پڑا جس جانے سے باز رہا ورنہ میرا رخ شاعری سے لیڈری کی طرف پلٹ جاتا اور ایک آدھ جلوس میں میری بھی کسی نظم نکل جاتی۔

جالندھر سے والدہ مجھے عاق کر دینے کی دھمکیاں دیتے تھے۔ اور میں خائف تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ آپ مرحوم کے خطوط نے تسکین بلکہ تسلیاں دی تھیں لیکن ۱۹۴۲ء کے آغاز میں شہرت کے ساتھ عسرت کا ایسا زمانہ تھا کہ قلم اور زبان دونوں چکیاں تو چل رہی تھیں۔ مگر اس مجموعے سے کھینے کے لئے پیٹ بھر آٹا مشکل میسر ہوتا تھا۔ اچانک رسالہ نونہال اور ہزار داستان کی جیسے ایڈیٹری ساٹھ روپے ماہوار اور ساتھ ہی میری اقامت کیلئے دفتر کے ساتھ والا کمرہ لئے ہوئے سامنے آئی میں نے جھٹ منظور کر لی۔ بیوی نے دفتر کے ساتھ کے کمرے کو پسند نہ کیا۔ وہ لاہور کی بجائے جالندھر کی حویلی کو آباد اور میری والدہ کو شاد کرنے چلی گئی۔ دونوں ننھی بچیوں کو بھی ساتھ لے گئی میں ہزار داستان اور نونہال میں اٹھ آیا۔

عرض کر چکا ہوں یہ ایسے ادبی رسالے تھے جن کا معیار حکیم احمد شجاع ایسے صاحب کے ہاتھوں قائم ہوا تھا یہ مجلّے اور دارالاشاعت ادب لطیف بھی ممدوح نے بعض دوسری مصروفیات کی وجہ سے اہل ثروت پراچہ خاندان کے ایک نونہال جناب نعیم کے سپرد فرما دیئے تھے۔ میرے لئے ان رسالوں کی ادارت بڑی جسارت تھی۔ ہزار داستان افسانوی اور نونہال بچوں کے لئے بہترین تفریحی تعلیمی ادب پیش کرتے تھے۔ اور افسانے اور ناول زیادہ تر تو انگریزی سے ترجمے کئے جاتے یا انگریزی ناولوں سے (بغیر نام ظاہر کئے) ماخوذ ہوتے تھے نعیم صاحب نے بہت سے ایسے ہی ترجموں کے ڈھیر میرے سامنے رکھ دئے جن کی اصلاح لازم تھی۔ "سنگ آمد و سخت آمد" یا "ذوق سلیم" مدد دے کر میں نے ان کی مدد سے ناول خود لکھنا شروع کیں۔ اور کتربیونت کے ساتھ اچھا ہوا ترجمہ کرنے والوں کو افسانہ نویس کا نام دے کر اور ایڈیٹری کے درمیانہ الفاظ سادہ کر کے شائع کرنا شروع کر لیا پہلی اشاعت تیار ہو رہی تھی۔ میرے حریفوں نے ایک اخبار میں چھپوایا: "جالندھر کی ایک گلہری گنجی نے لاہور میں طبل ہزار داستان کا بہروپ بھر لیا ہے" میرے دل نے مجھ سے کہا۔ او شاعر نامدار اسکول سے بھاگ نکلنے کی سزا ملنے ہی والی ہے۔ "گلہری" انگریزی پڑھ لیتی تو گنجی کیوں کہلاتی۔ میں نے کہا یار حوصلہ نہ ہار۔ دوسروں کے ترجموں میں انگریزی جانے بغیر اپنے ذوق سلیم کی قینچی سے کتربیونت کرتا رہ۔ کسی پر ظاہر نہ ہونے دے کہ تو یہ لے پاس نہیں ہے تو مشفقانہ مدح سرائی سے یہ ترجمے ان کے اسمائے گرامی کے ساتھ چھاپ دیا کر۔ کوئی نہ بولے گا۔ دل نے کہا تیرا طبع زاد افسانہ بھی ہونا چاہئے۔ میں نے کہا دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔

ناول اور افسانہ پڑھنے کی وحشت تو لڑکپن سے تھی ہی لیکن افسانہ لکھنے کی طرف کبھی دھیان ہی نہ دیا تھا۔ اور اسے شعر کے مقابلے میں بہت گھٹیا صنف

گردش تھا۔ اس تردد نے ایسی شدت اختیار کی کہ رات بھر نیند نہ آئی۔ دو بجے اٹھا۔ قلم اٹھایا۔ گرمی کا موسم اور گرد و پیش پر اور پڑ رہے تھے یہی صورت پر نہیں بازار کے کھمبے پر ٹنگے ہوئے بجلی کے قمقمے پر قربان ہو رہے تھے۔ میں نے افسانہ لکھنا شروع کیا۔ گھسیٹ ڈالا اور نظر ثانی کیے بغیر ہی کاتب کے سپرد کر دیا۔

یہ افسانہ "آوارگی" اور ایک ترانہ چھپنے جب ہدایت زدہ غزل ہزار داستان کی پہلی اشاعت میں نیز نونہال میں چھپ گئے۔ یہ ایک طبع زاد کہانی اور ایک نظم۔ دونوں رسالے جناب حبیب ایڈیٹر الناظر مقبول حسین زیدی کی وساطت سے تحفہ اول پرچے میرے سامنے آئے تو ایسا معلوم ہوا جیسے تخت سلیمان پر سوار انظار السموات سے بھی اوپر اڑا چلا جا رہا ہوں۔ شاید ان ہی دنوں کہا تھا۔

انجمن کو دکھا دوں ـــ کہ ستاروں سے بھی آگے
انساں کے نقش کف پا ہیں کہ نہیں ہیں۔

ان دنوں سید امتیاز علی تاج کے ہاں چند ادیب (اہل ذوق) محض ادبی خوش گپی کے لیے جمع ہوتے تھے۔ میں بھی حاضری دیتا۔ ہزار داستان میں افسانہ اچانک جو چھپا تو یہاں تعجب سے دیکھا گیا۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ میں انگریزی نہیں جانتا تھا۔ ان کی داد و آفرین تحسین سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کہ اگر یہ یاروں کو میرے تخلیق کردہ افسانہ پسند کرتے ہیں تو میرا مقام ہو گیا ہے۔ دوسرے سال ہی کیا ہیں تھی۔ اگر یہ لوگ ناپسند کرتے تو اس دور میں کوئی بھی اور نہ تھا جو میری پناہ بن سکتا۔ اب تو میں نثر ہو یا غزل، گیت، نظم، ترانے، ڈرامے، افسانے بیک وقت میرے چشمۂ طبع سے ابلنے لگے۔ یہ سب بیدار خود درد تھی۔ یاران شوق نے رنگا رنگ کے گل بوٹے زمین شعر و ادب سے پیدا ہو پیدا کر دیے تھے۔

ہری چند نے بی۔ اے کر لیا تھا۔ میں نے اسے اردو میں ایم اے کرنے کا مشورہ دیا ـــــ وہ ہوسٹل چھوڑ کر میرے پاس دفتر کے ساتھ والے کمرے میں آ گیا۔ میں نے اس کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا بھی شوق دلایا۔ ابھی شعر میں کچا تھا۔ خیال بلند طبع ندرت پسند مگر مشق کے بغیر خیالی طبع ندرت پسند کیسے سود مند ہوتی۔ ایک دو شعر ایک دو مصرعے کہہ دیتا میں غزل پوری کر دیتا یا میرے کہنے سننے پر ترتیب الفاظ اور بندش پر غور کر لے تو لگ لیکن خوش ہی۔ اور ساتھ ہی ایم اے کی تیاری۔ فکر و استغراق کی راہ میں حائل تھے۔ ابھی شاعر بننے کے لیے بڑا وقت درکار تھا۔
اسی طرح فاخر ہریانوی اور سوہن لال ساحر نے مولانا سید جعفر علی احسن ایم اے کی غزل جالندھر سے اصلاح کے لیے آتی۔ فخر الدین ناطق ملتان سے مشورہ لیتے تھے۔ اچھا خاصا استاد بن گیا تھا لیکن یہ پیری مریدی نہیں تھی۔

کالجوں نے اور بھی ہندو مسلمان نوجوان شاعری کا مزہ مسلے کر آئے۔ کچھ انٹ سنٹ کہہ لاتے میں بات بنا دیتا۔ وہ چھپ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ یہ اخبار رسالے خرید کر دوستوں یاروں کو بہم پہنچاتے۔ مشاعروں کنسرٹوں میں بھی پڑھتے اور داد ہی نہیں انعام بھی اینٹھ لاتے تھے۔ رحیم بخش اخگر داجے شیا،

عارفی اجو اسلامیہ کالج کا طالب علم اور دل شیدا تھا۔ ایسے ہی مستفیدوں کے لئے میرے ہاں بہت آتا جاتا۔ نوجوان طالب علموں کو شاعری کا شوق دلا کر میرے پاس مشاعرہ کرانے لایا کرتا۔ صرف ایک شاگرد خود کہتا تھا —— وہ روحی شعلہ — !

میں نے نقطۂ نظر زبان کو رنگا رنگ نغمگی سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اظہار ہی سہی، جو نئے نئے تجربے سے وہ زبان زد عام ہو رہے تھے۔ جہاں ہی نہیں پڑھنے بھی ان کو لالچ، اور نئے لکھنے والے ہی نہیں روایات پرست استاد شاعر بھی اپنی طبع کو ان نئے پیمانوں سے ناپنے لگے۔ ہر جگہ میں مجھ پر انگلیاں اٹھتیں۔ بازاروں میں میرے دائیں بائیں سے "ابھی تو میں جوان ہوں" "چپکے جا" "اور دیکھتا چلا گیا" کے آوازے سنائی دیتے۔ ان نظموں کی پیروڈیاں بھی ہوئیں اور تتبع بھی کیا جاتا رہا۔ بسنت۔ برسات۔ تاروں بھری رات، جو فانی کشتی۔ دیکھتا چلا گیا۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔ فرصت کی تلاش۔ کوشش کرتا ہوں۔ چاہے غیر نظمیں، نغمے اور ترانے سب اسی دور کے ہیں۔ ماہوران نظم واقعی شہر تھے۔ آج کون اندازہ کر سکتا ہے کہ سامعین اور شعراء پر میری اس اپج نے کیسے متضاد اثرات جاری کئے۔ سامعین میرے شعر اور ترانے گنگناتے ہوئے اور اساتذہ خاص الخاص ٹکسالی زبان میں طعنے سناتے ہوئے نکلتے۔ وہ پھر اسی طرح کہنے کی کوشش فرماتے۔

سات ماہ بعد ہزار داستان اور نونہال کے مالک سے بگڑ گئی۔ میرا اٹھنا بیٹھنا سید امتیاز علی تاج کے ہاں زیادہ تھا۔ نعیم صاحب دارالاشاعت پنجاب کو دارالاشاعت ادب لطیف کا رقیب سمجھ بیٹھے تھے۔ ایک دن میرے وہاں آنے جانے کا تذکرہ فرماتے ہوئے تلخ نوائی پر اتر آئے۔ میں نے قلم رکھ دیا، بقیہ چیک بھی طلب نہ کیے سلام بھی نہ کیا۔ اپنا بستر اور چند کپڑے اٹھا کر چل دیا۔ اسمبلی ہال جانے کی بجائے شفیع کی سرائے میں رات گزاری۔ پنڈت کچھ روز پہلے ہی اپنی بہن بہنوئی کے ساتھ رہنے کے لئے آگرہ روانہ ہو چکا تھا۔

دوسرے روز ساڑھے تین روپے ماہوار پر دارالاشاعت پنجاب بیٹھے ڈولا ہو رہے۔ اس پرانی کرسی پر بیٹھا تھا جس پر سالک صاحب مدتوں تشریف رکھ چکے تھے۔ اس روشنائی زدہ کھردرے میز پر جہاں وہ مدتوں قلم فرسا رہے تھے میں بھی ہل چلانے لگا۔ یہاں مجھے واقعی بہت زیادہ ذہنی فائدہ ہوا۔ سید امتیاز علی صاحب مرحوم ایسے فاضل مصلح کا قرب اور استفادہ میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی فرمائش پر اپنی اپج اور روش کے علاوہ حالی کی سادہ نظم گوئی کی مشق بھی میں نے بہم پہنچائی۔ میرے دور کے دوسرے شعراء کی لفظی کرتب اور میری سادگی و پرکاری سے سید صاحب کو کوئی سروکار نہ تھا۔ مرحوم اس معاملے میں کسی اجارہ داری کے قائل نہ تھے۔ وہ اپنے فرزند امتیاز کی ادبی روش کو بھی تہذیب و تمدن کے معاملے میں گوارا نہیں کرتے تھے۔

اس جگہ کام سے مجھے ادب و شعر کی افادیت، چند مدارج کو سمجھنے کا موقع ملا۔ یہاں مقاصد متعین اور قوانین سخت تھے۔ شعر و شاعری میں بھی

اپنی محنت کوئی چیز نہ تھی۔ تہذیب اور پھولوں کے علاوہ دارالاشاعت سے نئی نئی کتب کی اشاعت ہوتی تھی، اور مجھے پڑھنے میں کچھ نہ کچھ کام کرنا پڑتا تھا۔ بچوں میں نظم و نثر لکھنے کی مشق سے سادہ سے سادہ الفاظ میں اظہار خیال کی مہارت ہو گئی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ قوت شعر گوئی میں اپنی انفرادیت کے سبب ایک ایسے حلقے میں شامل ہو گیا جو چند روز بعد نیاز مندانِ لاہور کہلانے والا تھا۔ نیاز مندانِ لاہور کون تھے۔ عرض کر چکا کہ امتیاز علی کے ہاں جو اہل ذوق اور اہلِ تعلق جمع ہوا کرتے تھے۔ پروفیسر سید احمد شاہ پطرس بخاری اس بزم کی جان تھے، شیخ عبداللطیف تپش شکل پسند شاعر، حضرت مولانا سالک اخبار نویس، شعر و شاعری کے علاوہ لطیفہ گو، بذلہ سنج اور سب سے بھاری حریف ان کو ہم سب حضرت تاجور کے مقابلے میں استاد کہتے تھے۔ جگل کشور مہر اداب احمد سلمان) اگرچہ ادیب شاعر نہ تھے لیکن سخن فہمی، تنقید نکتہ رسی اور پیروڈی کرنے میں بے پناہ۔

پنجابیوں کے اردو ادب و شعر پر یوں تو لکھنؤ، دہلی، علی گڑھ میں بہت کچھ کہا جاتا تھا۔ پطرس کی نکتہ رسی، سالک کی زبان دانی اور مجید عاجز کا رنگ دیکھ کر ان سب کو شکست جواب ہوتا تھا۔ یہ سب دوست میرے فن کے سنورنے کا باعث بنے۔ اس محفل میں شعر سنانے سے پہلے خیال اسلوب اور بندش کی نوک پلک سنوار لینا میرے لئے بہت ضروری تھا۔ ان کے فقروں اور ضلع جگت سے بچ جانے میں بہت کوشش کرتا لیکن کہیں نہ کہیں بھرتی پکڑی جاتی، کسی جگہ بندش ڈھیلی ثابت ہوتی۔ یہ لوگ ایسی پھبتی کستے کہ میرے کان گرم ہو جاتے۔

امتیاز اس محفل کی شمع تھے اور ہم سب پروانے۔ یہ پروانے عصر کے قریب آتے اور شام کی شمع جلنے سے پہلے منتشر ہو جاتے۔ یہاں لطائف و ظرائف، تلفظ و مزاح، لوک تھو، نک سب کچھ ادب آموز اور دلنواز تھا۔ دارالاشاعت پنجاب کے مہتمم سید حمید علی امتیاز علی کے بڑے بھائی کاروباری اور عملی آدمی تھے۔ ہم سب کو گھنٹوں گھورتے تاہم دو ایک مرتبہ مسکراتے ہوئے جھانک لی جاتے۔ قبلہ سید ممتاز علی (مرحوم) بھی جو جھانک جاتے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے امتیاز ایک دوشیزہ ہے۔ لڑکوں کو اس کے گرد بیٹھنے تو دیا جاتا ہے لیکن بوڑھے بزرگ شدید نگرانی بھی کرتے رہتے ہیں۔

فرائض منصبی کے علاوہ میں نے اس دور میں بچوں کے لئے بہت سی ایسی نظمیں بھی لکھیں جو نو عمروں کے اپنے حسیات کی تصویریں ان کی اپنی زبان اور اپنے طرز بیان کو لئے ہوئے تھیں۔ نظمیں شاعروں میں تو کام نہ آتی تھیں البتہ ننھی پود کے دلوں میں ہمیشہ کے لئے سر اٹھا گئیں۔

ان ہی دنوں پطرس کے چھوٹے بھائی ذوالفقار علی بخاری سے میرا یارانہ ہو گیا۔ یہ منشی فاضل کر رہے تھے۔ خود پطرس سادہ پرکار مزاح نثر لکھنے میں اپنی نظیر آپ تھے کبھی کبھی فارسی میں شعر بھی کہتے۔ ان کے والد پرانے دور کے وضعدار نکتہ سنج اور باغ و بہار بزرگ تھے۔ بڑے بھائی نصرت بخاری بھی اچھے خاصے شاعر تھے لہٰذا ذوالفقار نے شاعر بننا لازم گردانا۔ طبع انتہا کی شوخ، ذہن بلا کا رسا، معیار سخن بلند لیکن معیار کی بلندی کے ساتھ شعر کہنا محنت اور جگر کاوی چاہتا ہے۔

اور لونڈے باز آدمی کو محنت سے کیا کام ـــــ یہ پہلی ذوالفقار علی بخاری نے پشاور سے ہی ایک مشاعرہ پڑھا۔ پشاور کے شعرا جو فن کے حریف تھے چھریاں لے کر آئے۔ لیکن خیریت گذری پشاور کے لوگ مہمان نواز ہیں۔ میں نے بھی نئی رنگ کی نظموں سے ان کو ایسا رجھایا کہ خون خرابے کی گھڑیاں ٹل گئیں۔ چھری مار شعرا ہنستے بولتے مجھے کھانے کی دعوت دیتے اپنے گھروں کو چل دئے۔

محشر والوں نے بھی مجھ کو شاعر کہہ کر چھوڑ دیا　　　میری فرد عمل کو کہتے مجموعہ افسانوں کا

ذوالفقار نے مجھ سے اصلاح لینا شروع کر دی۔ ـــ پطرس زیادہ کرنے لگا دیکھو میرے چھوٹے بھائی کو بھی اس ان پڑھ نے پھانس لیا ہے، لیکن یہ تو شعر شاعری کی بات تھی۔ اس میں پروفیسری نہیں چلتی۔

لوگ میرا مجموعہ کلام طلب کرنے لگے میں نے نغمہ زار مرتب کیا۔ ان دنوں فاخر ہوتی روڈ پر میرے ساتھ رہتا تھا میری شاگردی کا دم بھرنے کے باوجود سخن فہمی کے بارے میں فلسفیانہ باتیں کرتا۔ اور رفعت پسندی کی دعویداری پر اصرار تھا۔ استاد گرامی نے سہل ممتنع کی تلقین کر رکھی تھی لیکن مجموعہ مرتب کرتے وقت میں نے ارمان لی۔ استاد نے اپنا سارا کلام شاگرد کے سامنے رکھ دیا اس نے بیدردی کی چھری سے بہت کچھ کاٹ دیا۔ چھپا تو ہوا بہت سا ایسا حصہ ضائع ہو گیا جس میں عاشقی معشوقی کے معاملات کچھ زیادہ تھے۔ کچھ میرے ساتھیوں نے اپنے نام سے شائع کر لیا۔ ہر چند ملنے آتا میرے اشعار کے قتل عام پر جھلا آتا لیکن ہم دونوں فاخر کے بچنے ہوتے اب [illegible] جب سادہ جاتے مجموعہ کا نام فاخر نے زمزمہ تجویز کیا۔ پنڈت نے اس پر پھبتیوں کی توپ کی بجتی کسی پھبتیوں کی توپ لاہور کے عجائب گھر کے سامنے احمد شاہ ابدالی کی ایک بڑی یادگار ہے۔ سالک صاحب نے نغمہ زار تجویز کر دیا۔ مہاجہ احمد شاہ بخاری (پطرس) نے لکھا رعایت ہو گئی۔ کاغذ خریدنے کے لئے روپے پیسے نہ تھے سید حمید علی نے ڈیڑھ سو روپے ادھار دینے اور تنخواہ میں سے قسط وار کاٹ کر وصول کیے۔ لینے کی تو تنخواہ منظور کر دی فرمایا "خود مصنف اپنی کتاب خود چھاپے تاجر پر اس کی مدد اصول کے خلاف ہے"۔ بات اچھی تھی۔ امتیاز نیوٹرل رہا ـــــ

ذوالفقار علی بخاری کی بات تھی لیکن یہ بات کیسے ختم ہو [illegible] میں اچانک مولانا [illegible] ایک ریاست میں شاعر دربار کے عہدے کے لئے تین سو پچاس روپے ماہوار پر بلاوا آ گیا۔ یا حفیظ جالندھری شاعر دربار . . . . . پرانے زمانے کے بڑے بڑے شاعروں کے معیار نے اس نابکار کو فی البدیہہ شکار کر لیا۔ نغمہ زار کی کتابت دھری کی دھری رہی۔ مجبوراً تہذیب چھوڑ بچھاڑ یہ جادہ جا۔

تین مہینے شاعر دربار کی حیثیت سے ریاست میں کیا بیان کیا تھی اس کا ذکر آپ بیتی ہی میں مناسب ہے۔ یہاں اتنا ہی کافی ہے کہ ادھر [illegible] بار

میں پہنچا۔ ادھر چند ہی روز بعد میری والدہ کا انتقال ہو گیا "سوز و ساز" میں میرا غم و الم ایک سادہ سے مرثیے کی صورت میں درج ہے میں غمزدہ گھر پلٹنا چاہتا تھا۔ دربار کے لوگ مجھے کئی دن سے غم غلط کرنے کا مشورہ دیتے۔ وہ کئی سوغاتیں پیش کرتے وہاں ادھر سے گزرتی ہوئی ایک قاعدہ اور اس کے "دوم" دھاڑی ریاست پر چڑھے ہوتے تھے۔ ریاست کی رعایا مجھے بھی ان ہی میں گردان کر "ہاتھ" اٹھا کر سلام کرنے لگی۔ میرا "انگریز پن" اس ماحول سے باغی ہو گیا۔ یہ صورت حال میری جبلت کے خلاف تھی میں نے ان حالات سے متاثر ہو کر "رقاصہ" لکھی۔ اور بھرے دربار میں سنا ڈالی۔ نتیجہ حراست، حوالات، پھر یک بینی و دو گوش خیر سے بدھوا اپنے گھر جالندھر پہنچا اپنی والدہ کی قبر سے لپٹ کر رویا چیخا چلایا جسد لئے بر خاست ۔۔۔ بیتے دنوں کی وادی میری نظم "سوز و ساز" میں اسی عالم کی یادگار ہے مٹی کی ایک چھوٹی سی ڈھیری کے قریب بیٹھے ہوئے میں نے اپنا جائزہ لیا۔

پہلی مرتبہ اپنی ذات میں مجھے آغاز سے اب تک مسلسل چلتے چلے جانے والا ایک تنہا فرد نظر آیا۔۔۔ ایک راہی نہیں راہی نہیں۔ مجھے تو آج تک یہ احساس تک نہ تھا کہ چل بھی رہا ہوں تاہم چل تو رہا تھا لیکن اس چلتے چلے جانے کا کوئی مقصد میرا کوئی مقصد نہ تھا میری کوئی منزل نہ تھی میں محض ایک مسافر تھا۔ ایک آوارہ کبھی ادھر جاتا تھا کبھی ادھر ۔۔۔ غزل، زمزمہ، گیت، نغمہ، ترانہ، افسانہ محض ہنگ۔ اس پر دوستوں سے داد پانے کی ترنگ۔ یہ خالی خوش وقتی محض ذہنی عیاشی ۔۔۔ منزل اور مقصد کیا ہے۔ نگاہ اٹھائی۔ چاروں طرف گہرے دھندلکے۔ دھندلکوں سے بہت آگے محکم بلندیوں کی موجودگی کا تصور یا گمان۔ پیدا کم پنہاں زیادہ۔

شاید دھندلکوں میں چھپی ہوئی پگڈنڈیاں اور گزرگاہیں موجود ہوں۔ شاید غار ہوں، چٹانیں ہوں، کانٹے ہوں، شاید شیر چیتے بھیڑیے، سانپ اژدہے ہوں، شاید پھل پھول بہار، سبزہ زار، جوئبار ہوں ۔۔۔ ان دھندلکوں کے پیچھے کیا ہے۔ کس سے پوچھوں، کون بتائے۔ کیا وہ تصوری بلندیاں واقعی ایسی ہیں جیسے کشمیر کی راہوں اور کشمیر کے ارد گرد سلسلہ ہائے کوہسار لیکن ایسے میں ان دھندلکوں کی گھاٹیاں طے کرنے کا حوصلہ کسے، اور پھر کسی قلۂ کوہ پر تنہا جا کھڑے ہونے سے کیا حاصل۔ بجز تنہائی و بیچارگی ۔۔۔ کیا یہی بیچارگی و لطافت مقصد و منزل ہیں ۔۔۔

والدہ کی موت اور میرا آخری وقت موجود نہ ہونا میرے لئے احساس کا ایک نیا رخ پیدا کر رہا تھا۔ مجھے کہاں سے کہاں پہنچا رہا تھا۔ فرزندوں میں دو جوان مرگ ہو چکے تھے۔ ایک میں ہی آوارہ اس کی ممتا کا سہارا تھا۔ نکما ناکارہ کہ اس کے بستر مرگ کے قریب بھی نہ رہ سکا۔ وہ عزت والوں کی بیٹی اور بہو تھی۔ اس کے پاس زیور اور روپیہ بھی تھا۔ وہ چاہتی تھی میں کوئی کام کاج کروں لیکن بناؤں۔ اس کی اتنی تمنا تھی میرا بیٹا کماؤ بن جائے سربلند نظر آئے میری بیوی نے مجھے وہ زیور اور روپیہ سے بھرا ہوا صندوقچہ دکھایا جو وہ مرنے والی میرے لئے اس کے اوپر رکھ گئی تھی۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ یہ ترکہ اب میرے

کسی کام کا نہ تھا میں نے اسے ترک کیا۔ ہارے ہوئے جواری کی طرح پھر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اپنی بیوی بچیوں اور بیوہ بہن کو بوڑھے اور شکستہ دل والد کی نگرانی میں جالندھر چھوڑا اور ایک مبہم سا نیا احساس سینے میں چھپائے ہوئے لاہور پہنچا۔

وہی لاہور تھا وہی در و بام　　　وہی ہنگامہ خواص و عوام

اگرچہ قلب و نظر اب کسی اور پہلو کروٹ لینا چاہتے تھے لیکن شعر و شاعری کے ہنگامے سے الگ رہنا مجھ ایسے کے لئے ممکن نہ تھا۔ میں عامی تھا۔ مجھے عام بھیڑ بھاڑ ہی سے گزرنا تھا۔ میرا ہی تو شعر ہے ؎

میری کیا پوچھتے ہو قافلے کے ساتھ میں بھی ہوں
وہ راہرو ہوں کہ جس کا اک ہجوم غول رہبر ہو

لاہور میں قاصد اور رقاصہ کی شانِ نزول میری بازگشت سے پہلے ہی وارد تھی۔ ادبی حلقوں، مشاعروں، محفلوں اور اسلامی جلسوں میں مد و مداد کے ساتھ رقاصہ سنی جانے لگی۔ لوگ خود بخود دھڑا دھڑ چھاپنے اور بیچنے اور مفت تقسیم کرنے لگے۔ حتیٰ کہ رقاصاؤں کے نقیبوں نے اس کے جواب بھی لکھ کر چھاپ دئے۔ رقاصہ میری چھیڑ کیا چڑھ بن گئی ——— آج بوڑھا ہوں لیکن "ابھی تو میں جوان ہوں" کے ساتھ ساتھ رقاصہ نے اب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا ———

یہ ۱۹۲۵ء کے واقعات ہیں میں نے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اسلامیہ کالج کے چند طالب علم بھی اس مکان کے کمروں میں اپنے اپنے حصہ کا کرایہ ادا کر کے اپنی اپنی روٹی کا انتظام خود کرتے تھے۔ میں ڈیوڑھی کے ساتھ والے باہر کے بڑے کمرے میں گویا ان سب کا پاسبان تھا۔ کھوسٹ "میر اصمان" اور ان بھولے بھالے قبول صورت نوجوانوں کو غنڈوں سے محفوظ رکھنے کے لئے پیر ان تھا۔ میں اپنی ہنڈیا خود پکاتا۔ روٹی تنور سے آتی۔ حقہ گڑگڑاتا۔ اہل زبان آتے تو ان کے لئے زردے والے پان بھی منگاتا۔ اس گھونسلے کا نام ہم نے "سدا بہار" (EVER GREEN) رکھا تھا

اب کسی رسالے یا کسی ادارے میں نوکری کون دیتا۔ کون ہر روز بھاگ نکلنے والے غلام کا آقا بنتا۔ تیر تکے پر گذر اوقات ہونے لگی۔ بچوں کے لئے اردو کی تعلیمی کتب اور رسالے چھاپنے والے لاہور میں میرے مالک تھے۔ فرمائش پر رنگا رنگ سبق۔ جانت جانت کے رسالوں اور مجموعوں کے لئے نظمیں لکھتا۔ جنہیں وہ اپنے یا کسی اور مشہور آدمی کے نام سے چھاپتے۔ جو ان کی فروخت کتب میں ساجھی اور نفع میں حصہ دار ہوتا ———
میرا قلم اور زبان دونوں مصروف کار وقف بیگار رہتے۔ کالجوں کے طالب علم اور پرانے دوست احباب آتے ہیں فکر شعر بھی کرتا۔ ان سے بھی

مجلس رہتی۔ والد کے دارِ مفارقت کو سنبھی اور اودھم مچانے سے چھپاتا۔ دوسرے تیسرے پنڈت آجاتا چونکی ورپے ہیں ہم سب دیکھتے مہینہ عشرہ
مشاعرہ یا کنسرٹ میں داد سخن دینے جاتے جھولیوں واہ واہ سمیٹ لاتے۔ پنڈت ان دنوں اپنے بہن بہنوئی کے ساتھ اکبری دروازے کے باہر
فصیل پر بدررو کے کنارے رہتے تھا بقول ڈر تہذیب میں بدستور کام کرتا تھا ــــ غالباً یہی دن تھے جب حجاز پر شاہ ابن سعود کا قبضہ ہو گیا تھا
مدینہ منورہ پر گولیاں چلانے کی افواہوں کے سبب یہاں احتجاج ہو رہے تھے۔ مولانا محمد علی (مرحوم) کی سرکردگی میں ایک وفد حجاز گیا۔ ظفر صاحب
بطور سیکرٹری ساتھ گئے۔ [illegible] ــ جس کو بڑی قبولیت حاصل ہوئی۔

لاہور آتے ہی میرا پہلا مجموعہ نغمہ زار بھی چھپ گیا تھا [illegible]۔ الہ آباد و ملک حیدر آباد تک سے نئی کھڑت کی
اس نئی شاعری پر تبصرے اور تنقیدیں ہونے لگیں مضحکہ بھی اڑایا گیا آفرین کی آوازیں بھی اٹھیں۔ لاہور میں رسالہ نیرنگ خیال میں تاثیر کے قلم سے
ایک سیر حاصل مضمون شائع ہوا ــــ تاثیر سے مجھے ذاتی عقیدت رہی اس مضمون نے میری ان سے ملاقات کی تقریب بن گئی۔
پہلی ملاقات [illegible] ــ [illegible] ایک عجیب باب بھی بنا یاشت ١٩٢٥ء کا اگست
تھا کہ سرد ہوا میں ایک دن مولانا تاجور مجھ سے پہلی مرتبہ ملنے آئے۔ ایک خط لائے شیخ عبدالقادر نے جو ان دنوں پنجاب کے وزیر تعلیم تھے شملے
سے لکھا کہ ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ ارباب علم والوں کے ساتھ تم بھی شملے ضرور آؤ۔ یہاں تمہارے بہت سے مداح ہیں۔ اپنے
دو تین ساتھی شاعروں کو بھی لاؤ۔

چنانچہ پنڈت [illegible] اور [illegible] عارف کو ساتھ لے کر میں تاجور صاحب کے اہل زبان ہندو مسلمان سکھ تلامذہ اور دوسرے کے
دوسرے شعرا کے ساتھ [illegible] شملے پہنچا۔ تلوک چند محروم میانوالی سے آئے۔

شملے ہی کا یہ مشاعرہ تھا جس کو آل انڈیا کا نام دیا گیا تھا [illegible]۔ پھر اس کے بعد کبھی ایسا اجتماع نہیں دیکھا۔ اس
مشاعرے میں ہندوستان بھر کے اہل علم اور اہل ادب [illegible] سرکاری اہلکار ہی نہیں ہندوستانی آزادی کے بڑے بڑے علمبردار جوق در
جوق آئے تھے۔

حتیٰ کہ مولانا محمد علی (مرحوم)، خواجہ حسن نظامی (مرحوم)، پنڈت مدن موہن مالویہ۔ سر سپرو۔ پنڈت کرشن کانت مالویہ۔ راجہ نریندر ناتھ ــــ
سر سید راس مسعود [illegible] تھے ہز ہائی نس نواب [illegible] الدین احمد خاں والی ریاست لوہارو صدر تھے

ہم لاہور سے انجمن ارباب علم اور خود تاجور صاحب کے جھنڈے تلے شمار کیے گئے تھے۔ لیکن نہ جانے مولانا کو کیا سوجھی کہ ہم چاروں کو اپنے جھنڈے کے بالمقابل سٹیج کے نیچے دائیں بازو پر بٹھا دیا۔

شملہ کی راہ میں ایک ناگوار واقعہ ہو چکا تھا۔ مولانا نے فرمایا تھا۔ بھئی وہاں دوسرے شعرا کے مقابلے میں میر تقی بن جانا اپنے جھنڈے کے سوا کسی کو داد نہ دینا۔ میں نے قہقہہ لگا کر اس روش کے ساتھ میر تقی بننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے بیزار ہو گئے تھے۔ راہ میں ایک اور بات بھی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ مجھے پے در پے خاصے کی ٹھوکریں کھانی پڑی تھیں۔ جن سے میری آواز قطعاً بیٹھ گئی تھی۔ میں جب شملہ پہنچا تو قطعاً بول ہی نہ سکتا تھا۔ شیخ صاحب نے میرا یہ حال دیکھ کر رات ماسٹر دہلی عالی" کی ہیچ کی پھر ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس نے میرا منہ کھلوا کر گلا خوب خوب دیکھا۔ [illegible] اس نے تشخیص فرمائی۔ پھر کچھ گولیاں چوسنے کے لیے دیں جو میں خاصے کی ٹھوکروں کے جواب میں چوستا رہا۔

ابھی مشاعرہ شروع نہ ہوا تھا کہ میرے عقب سے کسی نے میرے کندھے کو بھاری ہاتھ سے دبایا۔ مڑ کر دیکھا تو ایک جوان شاداب جوانی سادہ رو کشادہ پیشانی۔ ترکی ٹوپی، [illegible] رکھے کرشمے کے ساتھ [illegible] مجھ سے مخاطب ہیں۔ میں نے اس کو کبھی پہلے نہ دیکھا تھا۔ میری نگاہ میں استفسار کی جھلک پا کر اس نے جھک کر میرے کان میں کہا "میں تاثیر ہوں" ساتھ ہی ایک خالی کرسی کھینچ کر میرے اور منڈت کے درمیان ڈٹ گیا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ بڑے شاعروں کے لیے فضا پیدا کرنے کی خاطر ہم چھوٹے شاعروں سے آغاز کیا گیا۔ میرے ساتھیوں [illegible] کا نام پکارا گیا۔ [illegible] سٹیج پر [illegible] دستور کے مطابق صدر کی کرسی کے قریب کھڑے ہونے کے لیے بڑھا لیکن نہ جانے کیا سوجھی مولانا تاجور نے جو منتظم [illegible] سٹیج پر کھڑے ہوئے تھے [illegible] کو سٹیج کے ایک کونے [illegible] کھڑا کر کے صدر کی کرسی سے بہت دور کھڑا کر دیا۔ شاعر کا یہ مقام ایک توہین تھی۔ [illegible] نے [illegible] دیکھا۔ [illegible] اشارہ کیا اور پلٹ آیا۔ تاثیر نے میرے ایما پر اٹھ کر بلند آواز سے با ادب عرض کیا۔ شاعر کوئی بھی ہو۔ اس محفل کا اصل مقصد وہ ہے۔ لہٰذا وہ صدر کے داہنے یا بائیں استادہ ہو کر کلام سنانے گا۔ کوئی وجہ نہیں کہ شاعر کو صدر کی مسند عزت کے قریب [illegible] آنے دیا جائے۔ تاثیر کی بات پسند کی گئی۔ تالیاں پٹ گئیں۔

مولانا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ شیخ صاحب نے اٹھ کر معذرت کے ساتھ [illegible] کو پکارا [illegible] چھوٹے سے وقفے نے سامعین کی توقعات اور بڑھا دیں۔ [illegible] نے غزل شروع کی۔ [illegible] پڑھنے کا انداز نہایت دلکش تھا۔ [illegible] اور [illegible]

کی ابتدا ہی سے دھاک بیٹھ گئی ہے

جمع ہیں احباب بالیں پر مرے
موت کتنی خوبصورت بن گئی

اب تک بعض لوگوں کو یاد ہے۔ ایک مدت تک شمس کو دیکھتے ہی یار دوست "خوبصورت موت" کہہ اٹھتے تھے۔

اب وقفہ شروع ہوا۔ شمس کی غزل کے بعد ایسے شعراء جو مشاعرہ بازوں کے نزدیک سب سے آخر پڑھنے والے ہوا کرتے ہیں، بلائے جانے لگے۔ ادھر سے سوہن لال ساحر ہری چند اختر نے تحت اللفظ ایسا سماں باندھا کہ ارباب علم نے اپنے بہترین خوش آواز کو اس اعلان کے ساتھ بلایا کہ مقدم تو آپ ہی سب سے بعد میں ہے مجلس بڑی دکھانے کے لئے تشریف لائے۔ آپ نے برسات پر ایک نظم آغاز کی: "ٹپ ٹپ ٹپاٹپ مینہ موسلادھار" برسات کا سماں باندھنے لگے۔ یکایک شور اٹھا حفیظ حفیظ حفیظ۔ معلوم ہوتا تھا سامعین میں کچھ لوگ لاہور میں نظم برسات سن چکے ہوئے تھے۔ ٹپاٹپ کے ساتھ میری یاد دفعتاً ٹپک پڑی۔

اب ایک حرکت اور ہوئی۔ مولانا نے لوگوں کے مسلسل شور سے مجبور ہو کر اور جھنجھلا کر فرمایا حفیظ جالندھری کا گلا بیٹھا ہوا ہے۔ اگر گلے کے بغیر شعر سنا سکیں تو بسم اللہ تشریف لائیں۔ یہ طرز تخاطب اس محفل میں مناسب نہ تھا۔ اس کا اثر اچھا نہ ہوا۔ میں سینہ درد کا اثر دور کرنے والی گولیاں بھی چوس رہا تھا۔ شاید معذرت کر دیتا۔ لیکن ناظم نے جسے میرا حال قطعاً معلوم نہ تھا۔ مجھے سٹیج کی طرف دھکیل دیا۔ میں نے حاضرین سے معذرت کی۔ دیا آتش کا شعر پڑھا۔

گلا بیٹھا ہوا خدمت اذاں کی وہ بھی کعبے میں
بجلے سے ہم دیا لائے تھے ناقوس برہمن بھی[1]

یا ایہا السامعین۔ میری شاعری محض میرا "گلا" ہے۔ لیکن آج یہ گلا دب گیا ہے۔ تعمیل ارشاد کر رہا ہوں مگر بازی نہ ہو سکی تو تحت اللفظ اس سے بھی ناکام رہا تو آپ کو بیٹھنے بیٹھنے چھوڑ کر بیٹھ جاؤں گا۔" مجھے اس وقت مولانا کے علانیہ طنز کا بڑا غصہ تھا۔ میں نے ایک غزل آغاز کی۔ کھولتے ہوئے خون کی گرمی یا چوسی ہوئی ٹکیوں کا اثر تھا کہ آب رفتہ باز آمد کا مضمون ہو گیا۔ آواز کھل گئی — یہ اشعار بار بار سنے گئے۔

مجھ کو ان مجبوریوں پر بھی ہے اتنا اختیار
آہ بھر لیتا ہوں میں فریاد کر لیتا ہوں میں

---

[1] اصل شعر میں "گو ہے جسے میں نے بھی" سے بدل دیا ہے۔ حفیظ

حسن بیچارہ تو ہو جاتا ہے اکثر مہرباں — پھر اسے آمادۂ بیداد کر لیتا ہوں میں
ہاں یہ ویرانہ یہ دل یہ آرزوؤں کا مزار — تم کہو تو پھر اسے آباد کر لیتا ہوں میں
جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے خدا — ایک عادت سے کہ تجھ کو یاد کر لیتا ہوں میں

مجھے بار بار اٹھنا اور جھک جھک کر سلام کرنا پڑا۔ بے جان روایتی شاعری کے بہت پیٹے گئے "نغمہ زار" کی بہت سی نظمیں ابھی ذہن میں جوان ہوں بسنت۔ چاندنی، سیر برسات۔ فرصت کی تلاش۔ اور بہت سی غزلیں۔ لوگوں نے شملے کے ایک ہی مشاعرے میں سن ڈالیں۔ جو بعد میں "نغمہ زار" کی قدر دانی اور میری تنگ حالی کے دنوں میں مددگار بن گئیں۔ مشاعرہ دن کے دو بجے شروع ہوا تھا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے ختم ہوا۔ خواجہ حسن نظامی نے خاتمے کی تقریر میں حفیظ جالندھری کو ہندوستان گیر شہرت کا دولہا قرار دے دیا ——!

ایک مدت سے کسی بات پر ہنسی نہیں آئی تھی۔ آج بیٹھے بیٹھے اوپر کے حروف لکھتے ہوئے عہد جاہلیت کی اس یادداشت پر بے اختیار ہنسا۔ آپ دیوانہ سمجھیں گے۔ اگر میں یہ بھی بتا دوں کہ ہنسی کے بعد آنسو بھی نکل آتے ہیں جس کو میرے بائیں ہاتھ نے پونچھ ڈالا ہے۔ جیسے ہی آپ کو میں نے عمر بھر شریک غالب رکھا ہے لیکن اپنے آنسو خود ہی پونچھتا رہا ہوں معاف کیجئے گا۔ یہ ایک اور کہانی ہے —— میں نے دولہا دولہن کے اس گٹھ بندھن پر بہت کچھ لکھ کر کاٹ ڈالا ہے۔ صرف یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اپنی منکوحہ یعنی اس ہندوستان گیر دلہن یعنی شہرت کا راج سہاگ قائم رکھنے کے لئے مجھے بڑے بڑے صدمے اٹھانے پڑے ہیں۔ اگر میں یہ واقعات بیان کر دوں تو شاید آپ اتنا ہنسیں کہ آنسو نکل آئیں۔

شملے کے ان چند روزہ قیام کے دوران ارکان ارباب علم نے محفلوں اور ٹی پارٹیوں میں کچھ ایسا رویہ اختیار فرمایا کہ میں تو کیا شیخ صاحب ایسے ضابطے کے چہرے پر بھی ملال اور انقباض کے آثار پیدا ہو گئے۔ میں اپنی شاعر برادری کی بعض گھٹیا باتیں بیان کرنے سے قطع نظر کرتا ہوں۔ البتہ یہ تذکرہ لازمی ہے کہ چوتھے دن تاثیر میرے ہوٹل کے کمرے میں وہ اخبار لایا تو مشاعرے کی روداد سے بھرے ہوئے چار کالم نظر آئے۔ یہ سیکرٹری کی طرف سے پریس رپورٹ تھی۔ ان کالموں میں وہ شعرا نام بنام اپنے کلام کے ساتھ بہ اعزاز گنوائے گئے تھے جو سٹیج پر تشریف لائے تھے۔ گنے نہ گئے تھے۔ آخری سطروں میں یہ فقرہ تھا۔ ایک پنجابی موسیقار حفیظ جالندھری نے بھی ترنم ریزی سے محفل کو محظوظ کیا۔

میرے ساتھیوں میں کسی کا نام تک نہ تھا۔ پنڈت اور تاثیر مسکراتے اخبار پڑھتے ہوئے فقرہ بازی کر رہے تھے کہ سوہن لال ساحر بھی

اخبار لئے ہوئے آئے۔ سخت خفت میں تھا۔ یہ غصہ بہت جوان اور دست دراز تھا۔ بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا گیا۔ ورنہ مسلم ہوٹل کی نچلی منزل میں جواب آں غزل کی نوبت آجاتی۔

پنڈت اور تاثیر ایڈیٹر کے سکینڈل پوائنٹ کی بہار دیکھنے کے بہانے چل دیئے۔ واپس آئے تو ارباب علم کے مقابلے میں بزم ادب پنجاب کا منصوبہ ساتھ میں تھا۔ یہ تجویز تھی کہ اپنی علمی بے لطفی اور کم مائیگی کے سبب پہلو تہی کرنی پڑی۔ لیکن آج ہمیشہ کے لئے ملال ہو گیا کہ اس شخص نے بہت عرصہ پہلے اپنے کے ... پکڑ لیا تھا۔ پھر جب پنڈت بھی اس کے ساتھ شامل ہو

دونوں ہم تینوں شملے کے پست و بلند کو اپنے پاؤں کے پیمانوں سے ناپتے اردو شعر و ادب کے سر پر مدتوں کی جمی ہوئی استادانہ دھونس کو ہمیشہ کے لئے رگڑ دینے کے لئے حسن اظہار خیال کے لئے آزادی سے پھلنے پھولنے کی فضا پیدا کرنے کے لئے مؤثر قدم اٹھانے کا مشورہ کرتے رہے۔

صدر کسے بنائیں۔ گرامی بہت بوڑھے۔ اقبال بہت بلند۔ شیخ عبدالقادر صاحب کا ملنا ناممکن۔ میں نے سالک کا نام پیش کیا۔ تاثیر نے کہا۔ تاجور کے پیر بھائی ہیں۔ دونوں رسا کے شاگرد جو کہ ارشد تلمیذ داغ ہیں۔ پنڈت بولا سالک صاحب میں علامہ تاجور کے مقابلے کی قربی تو نہیں مگر ماشاء اللہ توند چلے ہیں۔ رہی شاگردی۔ ڈاکٹر اقبال بھی تو داغ کے شاگرد کہلاتے ہیں۔ میں نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے۔ رتبہ شاگردی میں نسبت استادی ... سالک سے بہتر صدر نہیں۔ نثر نظم دونوں میں باغ و بہار۔ خوش گفتار۔ مدیر زمیندار۔ افکار و حوادث نگار۔ اور پھر یاروں کے یار۔

مجھے سیکرٹری بننے کے لئے منایا گیا۔ تو پنڈت نے سالک۔ اور حفیظ کی حمایت پر نقد و نظر اور ادعا زور ... کی پھبتی کسی۔ پنڈت امیر نائب مقرر ہوئے۔ تاثیر ... پر تیار لیکن کوئی عملی عہدہ قبول کرنے سے انکار ــــ

یہ بزم پر جم گئی۔ ہم لاہور آ گئے۔ سالک صاحب نے صدارت مان لی۔ اب وہ ہنگامہ شروع ہوا۔ وہ اودھم مچا جس سے لاہور کے سیاسی مذہبی۔ دھڑی اکھڑی جیسے جلوس تو تھم نظر آنے لگے۔ ادھر پورا پنجاب اور یہی مشغلہ سخن سازی و شعرہ بازی لیلوریکا روبار۔ ادھر دو چار فرد۔ ہر کوئی فکر معیشت کے پنجے میں گرفتار۔ یہ تحصیلی فضائی۔ ارباب علم میں مرتبہ۔ اقتدار و ثروت و وجاہت و دولت سب کچھ ہمارے یہاں آنے والے مشاعروں کے اشتہار چھاپنے کی بھی توفیق نہ تھی۔ وہ تو نعرہ زنی کی بانگ اور فرقت نے بات نباہ دی۔ ہفتے عشرے دونوں طرف سے

بڑے بڑے اشتہارات۔ پوسٹر لاہور کی دیواروں پر نظر آنے لگے "فلاں روز ایس۔ پی۔ ایس کے ہال میں مشاعرہ ہوگا۔ حفیظ جالندھری نیا کلام سنائے گا۔ دوسرا اشتہار لگتا "مشاعرہ فلاں روز نہیں فلاں روز ایس۔ پی۔ ایس میں نہیں بلکہ فلاں مقام پر ہوگا۔ ارباب علم کے فلاں فلاں ممتاز شاعر داد سخنوری دیں گے" تیسرا اشتہار لگتا "مشاعرہ فلاں تاریخ اور ایس۔ پی۔ ایس ہال ہی میں ہوگا" "عظیم الشان مشاعرہ ہوگا" "سادہ عوامی مشاعرہ ہوگا" وغیرہ وغیرہ۔

اکثر و بیشتر میں اور پنڈت خود اشتہار چھپوانے والے کے ساتھ جاتے وہ اُجرت زیادہ مانگتا یا سستی دکھاتا تو یہ مرحلہ اپنے چست ہاتھوں سے طے کر لیتے۔ اس آغاز میں "مخفے" تو بہت ساتھ تھے۔ درمے یا قدمے کوئی ہمارے ساتھ نہ چلتا۔ ہم سے اصلاح لینے والوں یا میرا لکھا ہوا اپنے نام سے پڑھنے والوں میں سے "نامی نامور" ہمیں اس مہم میں فرمایہ اور غیر اہم سمجھ کر دو گھڑی بتی بن گئے یا ساتھ چھوڑ کر غنیم کے کیمپ میں چلے گئے۔ وہاں آؤ بھگت کے ساتھ توقعات بھی تھیں۔ یہاں تہی خالی ہوتی۔ وہاں وکیل پروفیسر، ہیڈ ماسٹر ادبی رسالوں اور روزنامہ اور ہفتہ وار اخباروں کے ایڈیٹر مثلاً پنجابیوں میں میلا رام وفا، وشنو پرشاد فدا، اودھے سنگھ شائق، اثر صہبائی، عابد علی عابد، امام علی نازش وغیرہ اور سٹیج پار والوں میں عندلیب شادانی، شکور رامپوری، نعیم بیگ چغتائی، اختر شیرانی، اطہر دہلوی۔ ہمارے ہاں بس ڈھاک کے تین پات میں تاجور اور پنڈت۔ جناب سالک کو فرصت کم تھی۔ مہر کسی وجہ سے میرے مخالف ہو گئے تھے۔ بشیر سادہ دلی سے دونوں جانب شامل تھے۔ ہمارے مشاعروں کی رونق وہ کچے اور ادھ پکے تھے جن کو ہم تیار کرتے تھے۔ شیخ سر عبدالقادر مجھ پر بہت مہربان تھے۔ سب کے دوست اردو کے پھلنے پھیلنے سے خوش۔ ہم سب کے سرپرست وہی تھے۔

ہمارے صدر تھے سالک صاحب خوش مذاق، بذلہ سنج اور ان کے خاص اپنے رنگ تغزل کے ساتھ طرز نظم خوانی بھی خاص تھی۔ مگر کم فرصت تھے۔ روزنامے کی ادارت میں ہماری فضولیات کے لئے وقت کہاں۔

ہم نے ایک بزم خاصان ادب بھی بنائی تھی جس میں سالک، مہر، بشیر، پنڈت اور ایک دو اور بھی دوست شریک تھے۔ ہم جو کچھ اس بزم میں سناتے اس پر اعتراضات کیے جاتے اور مباحثہ ہوتا۔ لیکن یہ بزم چل نہ سکی۔ اس دور کا لاہور سخن فہمی کے معاملے میں بہت ہی بلند تھا۔ حتیٰ کہ جب ارباب علم والے مشاعرے میں طبلہ سارنگیاں لے آئے تو کسی نے اسے پسند نہ کیا۔ اہل علم اہل ذوق نے اس طرز کے مشاعرے سے نفرت کا اظہار کیا تو بھا۔ ماجے جو بھی آ موجے جیسے بجا ڈالے۔ سارنگیاں توڑ دیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ بھائی صاحب ہم پیچھے بیٹھ کر شعر سنتے

آتے ہیں کہ فقیر دیکھنے ————

یوں مشاعرے امن و امان سے ہوتے تھے۔ ہمارے ہاں سامعین بڑھتے جا رہے تھے۔ اخبار میں کام کرنے والے ایڈیٹر اور رپورٹر۔ ارباب علمیوں نے جھلا کر اخبار کی مرچ زیادہ گرم کر دیا۔ سارا پریس پنج پڑا میرے ساتھ پنڈت اور تاثیر کو بھی بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ میں نے گالی کا جواب کبھی نہیں دیا۔ البتہ پنڈت اور تاثیر کو چھیڑ کر کوئی جائے کہاں۔ اگر ہفتہ وار پارس کے فائل کھودے جائیں تو ان دونوں کے لکھے ہوئے اس دور کے بہترین ادب پارے مل سکتے ہیں۔ پنڈت نے ان دنوں دوزخی تخلص بھی کر لیا تھا —— اور تاثیر نظامی۔ قدوسی نہ جانے کیا کیا تھا انہوں نے بہت سی سیاسی مزاحیہ نظمیں اور غزلیں مولانا قومی مدظلہ العالی کے نام سے شائع کیں۔

نکمی باتیں —— یہ فن و ہنر کی ترقی و تنزل کے جھگڑے جھانجے شعر و شاعری، موسیقی و مصوری۔ ادب و ثقافت، طرز و اسلوب، خیال و اظہار خیال کیا ہے بچوں کی سی نکمی باتیں۔ "پریکٹیکل" دنیا میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس ترقی یافتہ اور سنجیدہ دور ادب میں اس "تضیع اوقاتی" تذکرے کی اجازت کیوں دی جائے —— اور پھر جو بزرگ شعرا اپنے مقامی محاورے اور بنے بنائے سانچے لے کر دوسروں کو ان ہی سانچوں میں ڈھال دینے اردو کی خدمت کرنے نکلے تھے وہ ملک گیری و کشور کشائی کا حق رکھتے تھے۔ ان سے بغاوت اور بغاوت بھی ایسی کہ قلعہ معلیٰ کی کوڑی میں ڈھلی ہوئی زبان بزم اپنے خاص الخاص سے نکل جا کر عوام الناس کے ذہن و جذبات کے گلی کوچوں بازاروں کے بھیڑ بھڑکے میں سرگرداں کر دی جائے۔ بھلا پنجاب والوں کو یہ حق کون دے سکتا ہے کہ اظہار خیال کے لئے نئی گھڑت کے محاورے نئے سانچے نئی تصویریں اور نئے چوکھٹے بے تکلف بنائیں اور بناتے چلے جائیں۔ پھر اس بے راہ روی کو آج اتنی مدت کے بعد کارنامہ بھی بتائیں —— !

یہ سب باتیں قصیدہ در مدح خود ہے خودستائی ہے۔ نکمی باتیں ہیں —— ہاں آج یہ باتیں نکمی نظر آتی ہیں۔ آج اردو شاعری کی فضا شاید ترقی فرما کر ان نکمی باتوں سے پاک ہو چکی ہے۔ لیکن مجھے یہ پوچھنا ہے کہ آج اردو شعر کو جو نئے اسلوب اور اظہار خیال کی نئی راہیں ملی ہیں۔ کیا خود بخود خلا سے پیدا ہو گئے ہیں؟ نہیں جناب والا! اس دور میں میری ہی یہ بیہودہ کوشش اور یہی جنگ بے ڈھنگ تھی جس نے سخنوری کی پری کو فضاؤں میں اڑنے کے لئے آزاد کر دیا۔ جسے چوٹے چکی کے محاوروں نے جکڑ بند کر کے زنان خانوں میں ڈال دیا تھا۔

آج یہ باتیں آپ کو نکمی اور بے ہودہ نظر آتی ہیں تو لیجئے آئیے۔ اس دور کے دوسرے کام کے لوگوں کی باتیں کریں۔

پورے برّ اعظم ہند میں ہندو مسلمان ہر جگہ ہر مقام پر شاعروں کے مقابل عملی زندگی کے مظاہرے فرما رہے تھے۔ غیر ملکی حکومت

سے آزادی کے لیے اتحاد کی تحریک ماند پڑتے پڑتے غائب ہو گئی تھی۔ ذاتی مفاد دست وگریباں تھے۔ بیرونی حکومت نے نفرت کے جو بیج بوئے تھے بار آور تھے۔ خلافت کے نام سے کانگریس کا ساتھ دینے والے زعما اپنے اتحادیوں کی مرتب فرمودہ نہرو رپورٹ کا منہ تک رہے تھے۔ آریہ سماجیوں نے شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں اس طرح اٹھائی تھیں کہ سارا ملک فسادات کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ ادھر تبلیغ و تنظیم کی آواز اٹھ رہی تھی تا آنکہ ۱۹۲۷ء کے آغاز میں ستلج پار سے آکر یہ فسادی بادل لاہور پر بھی پھٹ پڑا اور شہر قتل وغارت آتش زنی کی بسنت منانے لگا۔ چھرے چل رہے تھے۔ غریب کمزور بڈھے بچے قتل ہو رہے تھے۔ عورتیں اغوا کی جا رہی تھیں ——!

ابھی جانے دیجیے یہ تذکرہ تو ہولناک بلکہ شرمناک ہے۔ اس سے تو یہی شعر وشاعری کی باتیں ہی بھلی تھیں —— ! اچھا تو آیئے اس داستان کو نتیجے تک پہنچائیں۔ وہ باتیں کریں جو ادب اور ثقافت سے بے نیاز اور پریکٹیکل ہیں۔ لیجیے سنیے میں ان دنوں پنجاب بھر کی اسلامی انجمنوں کے جلسوں میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے چندہ جمع کرانے کا کام بھی ساتھ ساتھ ادا کر رہا تھا۔ اس لیے ہندو پریس مجھے کچھ اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا۔ حالانکہ ان دنوں میرے باہمی اتحاد کے لیے لکھے ہوئے گیت اور نظمیں ہر جگہ لوگوں کی زبان پر تھیں۔ کرشن بنسری مندروں تک کے بھجنوں میں شامل تھی —— لیکن چونکہ مدینے والے کے نام "پیام اسلام ہے جا" بہت مقبول ہو گیا تھا۔ اس لیے برادران وطن کے اخباروں میں آئے دن میری مرمت کر دی جاتی تھی۔ ارباب علم والے اس سلسلے میں دہلی سے ایک بڑی توپ لائے یہ حکیم لبھ نارائن ارمان تھے۔ وہ آتے ہی ایک ہندو روزنامے کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اور پہلے ہی دن اداریے میں میرے خلاف لکھا —— چند ہی روز بعد دیال سنگھ کالج کے مشاعرے میں صدر کی حیثیت سے گئے۔ ان کی مونچھیں بہت لانبی تھیں۔ غزل پڑھنا آغاز کیا: "ہم نے دیکھی ہی نہیں ایسی فسوں گر آنکھیں —— ارمان صاحب نے مصرع دہرایا۔ ہم نے دیکھی ہی نہیں ایسی فسوں گر —— فسوں گر پر رکے —— ابھی آنکھیں کہنے نہ پائے تھے کہ سامعین چلا اٹھے "مونچھیں" اب ان کا اصرار ہے کہ "آنکھیں"۔ سامنے سے شور اٹھتا ہے "مونچھیں" "نہیں مونچھیں نہیں آنکھیں" "نہیں آنکھیں نہیں مونچھیں" بہت خفا ہو کر محفل سے نکل گئے۔ سمجھے کہ مونچھوں پر حفیظ کا ہاتھ ہے۔ حالانکہ میں وہاں موجود نہ تھا۔ اور نہ کسی شاعر کو ہوٹ کرانے کے حق میں ہوں۔ اب آگئی میری شامت۔ اب کے شعر وسخن نہیں۔ بلکہ ہندو دیومالا کی توہین کا الزام لگا کر حفیظ کو کرشن کنہیا کی توہین کا مجرم ٹھہرایا گیا۔ فرمایا گیا کہ نرنکار کے اوتار کو اس ملیچھ نے ایک "امرد" کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور بنارس کے گھاٹ پر میری نظم کے ایک بند کو پوری ہندو جاتی کی ہتک ثابت کر دیا۔ کونسلوں میں سوال ہوئے شاہ عالمی دروازے کے اندر ایک جلسہ ہوا جس کے

صدر ان نادان ارمان تھے۔ اور موسوم "حفیظ جالندھری کی دریدہ دھنی" حفیظ بیچارہ نئے رنگ کی شاعری کے طفیل اس نئے رنگ کی بپتا میں پھنس گیا۔ مگر تحمل تو جلال تو بی کا ورد کر رہا تھا کہ آئی ہوئی یہ بلا ٹل گئی۔ پنڈت اختر، لالہ کرم چند (ایڈیٹر پارس) اور ان کے چند ہندو دوست خود بخود جلسے میں پہنچ گئے۔ اور حفیظ کی گویا ان ہندو بیوپاریوں کو سنائی۔ جو وہاں ایک ڈسٹرکٹ مسلے کے خلاف اس دھوم دھڑ میں دھن بلیدان کرنے آگئے تھے۔ ارمان دھرے کے دل ارمان بھی بنائے گئے تو سمجھدار بیوپاریوں نے دھن دان کرنے کی بجائے حکیم جی کے نیچے سے کرسی کھینچ لی۔ کونسل میں سوالات کو مسٹر منوہر لال وزیر تعلیمات نے سوال کرنے والے کی جہالت قرار دیا۔۔۔

اُستادی کی دھونس کو دور کرنے کی مہم میں میرے ساتھ محض تاثیر اور پنڈت تھے۔ تاثیر اردو فارسی عربی کے علاوہ دوسری غیر ملکی زبانوں کے ادب و فن کے دریاؤں کا غواص و تیراک تھا۔ یہ محاربہ اس کی صلاحیت نقادانہ کے لئے میدان پیدا کر رہا تھا۔ پنڈت کو فارسی میں ایم اے کی ڈگری لینے کے ساتھ ساتھ اردو نظم و نثر کی مہارت حاصل ہو رہی تھی۔ اس کے لئے بہترین شاعروں میں اور صاحب طرز نثر نگاروں میں عزت کا مقام بنا رہی تھی۔ ہر جگہ آزادہ روی سے لکھنے والوں کی امنگیں جاگ اٹھی تھیں مختلف مقامات۔ اردو میں بھی اور دوسری زبانوں میں بھی۔ اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق بہاری۔ اس تحریک آزادی اسلوب اظہار سے متاثر ہو رہے تھے۔ یہ دیکھ کر جامد روایات سند وقت کے مشہور ترین جرنیلوں کو محاذ پر بلا لیا۔ جن میں جنید غزل گو مرزا یاس یگانہ۔ اور سید المتغزلین کہلانے والے غزل طراز جگر مراد آبادی کے علاوہ اصغر گونڈوی ایسے منضبط و متحمل صوفی مشرب بھی اپنے واردات کے ساتھ لاہور میں وارد ہو گئے۔ حالانکہ میں ان سب کے نیاز مندوں میں تھا۔ اور بھی بہت سے بزرگ لاہور میں جمع ہو گئے۔ ان سب کے آ دمنے کے لئے ہندو کا سامان بھی کر دیا گیا عطر چند کپور تاجران کتب کی فرم کو لالہ سا لگا۔ مرکز اردو کے نام سے ایک شعبہ نشان ادارہ بنا یا گیا نئے دواوین سے غزلیں انتخاب ہونے لگیں۔ محکمہ تعلیمات کے ایک ڈائرکٹر "قطعی قطعی" کہتے ہوئے ان نصاب اور فروخت میں ممد و معاون قرار پائے۔ اگر ہے جناب۔ ساغر و سیماب بھی آملے۔ اور لاہور میں "بزم ادب پنجاب" کے ساتھ پنجاب ہی کو بنیادوں تک کو ڈھا دینے کے لئے ہر گلی کوچے میں مطلع و مقطع کی دونالیوں سے ردیفوں قافیوں کے گولے برسنے لگے۔

ادھر بھی تو نسبے ہوئے تھے۔ حفیظ۔ پنڈت اور تاثیر۔ ہمارا ملک ہفت وار پارس۔ ہماری فوج وہ پود جس کو آگے چل کر زبان کہنا ہوتا تھا وہ جسے اسلوب اظہار خیال کے لئے آزادی ملنے والی تھی۔ رسالے اور اخبارات کی پلٹنیں سب کے سب غنیم ہی کی صفوں میں تھے۔ ان سب کے نعرہ ہائے رجز کا جواب دینے کے لئے دفعتہً ایک غیر معروف جرنلسٹ نازل ہو گیا جس نے تمام آدمیوں کے دھڑے اڑا کر رکھ دیئے۔ یا اللہ یہ کون

ہے۔ مدتوں بعد پتہ چلا کہ یہ لالہ رتن چند تھے۔ جو ہمیں اخبارات میں پڑھتے دیکھ کر خدا خوفی کے جذبے سے مدد پر آگئے تھے یہ نئے نئے شاعر بنا کر نئی نئی نظمیں اور غزلیں لکھ کر دیتا۔ ان میں سے چونکہ بہت سے ایسے ہیں جو مشہور شعراء میں شمار ہوتے ہیں اور خود لکھتے ہیں۔ اس لئے وہ سب کچھ ان کا مال ہے تقدّم دوست اور مرید اپنے مراتب کو نگاہ رکھتے ہوئے عملی طور پر دونوں سے الگ تھلگ تھے۔ سالک صاحب ہماری بزم کے صدر اور بزم میں کھلے بندوں تھے مگر کچھ زیادہ ہی مرنجان مرنج ہو گئے تھے۔ امتیاز کے اہل نیاز مندان لاہور بام گپ ہانکتے۔ سالک صاحب استادوں کی پیری مریدی پر پھبتیاں کستے ہم ان کو چھیڑ چھیڑ کر استاد کہتے اور وہ کھلوا لیتے۔ لیکن مد مقابل توپ خانہ تھا۔ توپ کے منہ پر آ جاتے۔

عرض کر چکا ہوں کہ ملک سخن میں شخصی اقتدار کے خلاف ہم لوگ زبانی اور قلمی آویزش کی نئی باتوں میں الجھے ہوئے تھے۔ ادھر ملک بھر کے علمی خاص دعام اور ادبی دھوم دھام دکھا رہے تھے۔ جو زبر تھے وہ زیر کو زیر رکھنا چاہتے تھے اور جو بیچارے زیر تھے کم از کم ایک مرتبہ زبر کی سطح پر ابھر آنے کے لئے ٹوٹیاں لگا رہے تھے۔ ہم شاعر لوگ اس زیر و زبر میں بھی زیر و زبر تھے۔

اب ہمارا محاذ لاہور ہی نہ رہا تھا۔ بات بہت بڑھ گئی تھی۔ کانپور، لکھنؤ، دہلی، حیدرآباد دکن، بھوپال، بنارس، الہ آباد حتیٰ کہ کلکتہ، بمبئی اور رنگون تک سے آزادی اسلوب خیال کی نئی تحریک کے خلاف نعرے بلند ہو رہے تھے۔ دل نے کہا حفیظ یہی استادی کے مراکز پر دھاوا بول دو۔ ان بیسز (BASSES –) پر چاروں جانب سے لانگ رینج (LONG RANGE) کی توپوں کے گولے آ رہے ہیں۔ باہر نکلنے اور بار بار ان مراکز میں داخل ہونے کی صورت بھی پیدا ہو گئی۔

لیکن اس صورت نے مجھے ٹھنڈا کر کے رکھ دیا۔ مدراس میں انڈین کانگریس کا عظیم الشان سالانہ اجلاس تھا۔ صدر ڈاکٹر انصاری تھے۔ ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے دو اجلاس مدراس ہی میں ہو رہے تھے۔ جلسہ اول کے صدر شیخ سر عبدالقادر اور دوم کے جسٹس سر سلیمان تھے۔ ساتھ ہی ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی ہو رہا تھا جس کی صدارت کیلئے حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری کو شیخ صاحب کے ایماء پر دعوت ملی تھی۔ اخراجات کے لئے رقم بھی ———— شیخ اور میں ہم سفر تھے حیدرآباد سے شیخ الاسلام مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی بھی مدراس آئے ہوئے تھے۔ میں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے دونوں بڑے اجلاسوں میں اصول شکن سے دھواں دھار نظمیں سنائیں۔ اور جب مشاعرے کی صدارت پر متمکن ہوا تو سامنے صدر کانگریس ڈاکٹر انصاری، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دونوں صدر سر عبدالقادر اور سلیمان کے علاوہ مولانا محمد علی جوہر بھی موجود تھے۔ بلبل ہند سروجنی نائیڈو میرے قریب ہی سٹیج پر جلوہ فرما اور میری شان بڑھا رہی تھیں اور میں دل ہی دل میں واہ رے میں کہہ رہا تھا۔

یہ ۱۹۲۶ء کے دسمبر کی آخری تاریخوں کا واقعہ ہے۔ مشاعرے میں مصرع طرح کی غزلوں سے "بور" ہو کر ان بزرگوں نے مجھ سے میرے انداز کا کلام سننے کی فرمائش کی۔ میں نے "پریت کا گیت" "میرا اسلام لے جا" "کرشن بنسری" اور "راوی میں کشتی" نظمیں اوپر تلے سنا دیے۔ جن کو سن کر محترمہ سروجنی دیوی اٹھیں۔ انگریزی میں تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ ہندو مسلمان تو بیرونی اقتدار کو ملک سے دور کرتے کرتے اپنے اپنے جماعتی اقتدار کے لیے دست و گریبان ہو گئے ہیں۔ اور آج ان کے لیے کوئی واحد سٹیج نہیں جہاں مل بیٹھیں۔ الا شعر و شاعری کا سٹیج جہاں آج ہم سب جمع ہیں۔ آج گاندھی جی سے بھی زیادہ سوکھے ہوئے اس پنجابی شاعر نے ہمیں پریت گیت سنا کر جو راہ سجھائی ہے اے کاش ہم اسے اختیار کر سکیں ہم کو چاہیے کہ سیاسی لوگ جو کام نہیں کر سکے شاعروں کے ذمے ڈال دیں۔ میں اس جوان صدر مشاعرہ کو اس رہنمائی کے لیے مبارک باد دیتی ہوں وغیرہ وغیرہ ——

مشاعرے کا حال تو کیا چھپتا۔ سروجنی کے یہ الفاظ اور ان کے ساتھ حفیظ جالندھری کا فوٹو مدراس کے انگریزی اخبار میں دوسرے ہی روز شائع ہو گیا۔

"ہوٹل بسو تو مدراس میں ناشتے پر بیٹھے انگریزی اخبار کے پہلے صفحے پر زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی تصویر دیکھ کر اور شیخ صاحب قبلہ کی زبان سے سروجنی دیوی کے الفاظ کا ترجمہ سن کر غالباً خوشی میری باچھوں سے ٹپکی جا رہی ہو گی کہ شیخ صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا: حفیظ صاحب آپ بہت اہم مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ آپ کو شاعروں سے معرکہ آرائی چھوڑ کر اپنی خداداد صلاحیت کسی ٹھوس کام میں لگانی چاہیے۔"

میں نے استفساری نگاہ اٹھائی۔ میرے محسن کا خلوص جو بات الفاظ میں کہنے سے مجتنب تھا وہ ایک نگاہ نے میرے قلب کی گہرائی میں دی اور میری طفلانہ معرکہ آرائی کی خوش وقتی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔

میں اور اہم مقام —— کوئی ٹھوس کام ——

میرے دور کے بیشتر سیاسی نامور کس کشمکش میں ہیں۔ میرے ارد گرد کروڑوں ہندو مسلمان کیا کرنا چاہتے ہیں۔ جنگ عظیم، جلیانوالہ باغ، ترکی اور ممالک اسلامی۔ خلافت اور کانگریس۔ ہندو مسلم اتحاد، ایک پیالے میں پانی، شدھی اور سنگھٹن، فساد کی طغیانی، ٹیگور کی راگنی، اقبال کا پیغام، آزادی سے بیشتر آزادی کے بعد کے لیے شرطیں۔ نہرو رپورٹ، شملے اور مدراس کے مشاعرے۔ خواجہ حسن نظامی اور شریمتی سروجنی نائیڈو کے تحسین آمیز کلمات، پریت کا گیت۔ میرا اسلام لے جا، کرشن بانسری، حفیظ جالندھری مبارک باد —— میں سوچتا رہا سوچتا رہا ——

واپسی پر حیدر آباد میں مہاراجہ کرشن پرشاد نے مجھے دس بارہ دن مہمان رکھا۔ بیسیوں محفلیں منعقد ہوئیں۔ قدر دانی کا ایک نیا عالم دکھائی دیا۔ وہ جو مجھے اردو کا بربادکنندہ سمجھتے تھے۔ آئندہ کے لئے میرے مربّی اور مؤید بن گئے۔ مولانا سلیم پانی پتی، مرزا فرحت اللہ بیگ، ہوش بلگرامی استاد جلیل شیخ الاسلام حبیب الرحمٰن شیروانی اور ایسے ہی دوسرے مشاہیر نے مجھے اس طرح نوازا کہ لاہور میں مجھ سے متخاصم شعرا کی وجہ سے تمام اہل زبان کے بارے میں جو غلط فہمی میرے قلب کو رنجور کئے ہوئے تھی کافور ہونے لگی۔ سرسید کے پوتے سر راس مسعود نے پہروں میرا کلام سنا اور حالی کے مماثل مجھ سے کچھ ایسی توقعات وابستہ کرلیں کہ میں اندر ہی اندر اپنی بے مائگی پر شرما شرما کر رہ گیا۔ لاہور پلٹا تو میں کچھ اور بن رہا تھا۔ سر در گریباں تھا سوچ رہا تھا میں کیا ہوں، میں کیا کروں؟ آخر میرے قلب نے فیصلے کا اعلان کر دیا۔

یہ دنیا رزم گہ ہے تو سپاہی بن کے آیا ہے — مقامی بن کے آیا ہے نہ راہی بن کے آیا ہے
ملا ہے درگہِ حق سے تجھے عہدہ مجاہد کا — ترے شایاں نہ دنیا دار کا جامہ نہ زاہد کا
گھڑی سر پر کھڑی ہے اب کفن بردوش ہونے کی — تجھے فرصت کہاں ہے محوِ ناؤ نوش ہونے کی

یہ اعلان قطب الدین ایبک کے مزار پر مراقبہ کی حالت میں ہوا۔ میں نے شاہنامۂ اسلام لکھنا آغاز کر دیا جس کے تذکرے کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔

میں ان دنوں مخزن کا ایڈیٹر تھا۔ ان ہی دنوں مجید ملک سے بھی یاد اللہ ہوئی۔ ان یاروں دوستوں کے باہمی راز و نیاز کی ایک داستان ہے جس کا بیان طویل یہاں ممکن نہیں۔

عرض کر چکا ہوں کہ مدراس سے واپسی پر میں کچھ اور بن رہا تھا۔ میں نے معرکہ آرائی سے اجتناب کرنا شروع کر دیا۔ پرانی آویزش کے الجھاؤ سے نکلنے میں اگرچہ دقت پیش آئی لیکن ارادہ نیک ہو تو اللہ مدد کرتا ہے۔ وہ صفیں جو اردو مرکز میں درآمدہ شاعروں نے جما رکھی تھیں۔ ان شاعروں کی ذہنی باہمی پھوٹ کے سبب ٹوٹ گئیں۔ یاس یگانہ لکھنوی، جگر مراد آبادی، اصغر گونڈوی ایسے بڑے بڑے کلاندا مکان چھوڑ کر چل دیئے سیماب و ساغر نے بھی راوی کا پانی قدرے ثقیل پایا۔ اور پھر جمنا کے کنارے ڈیرہ جا لگایا۔ عطر چند کپور اینڈ سنز کا بہت سا روپیہ پرانی غزلوں اور اردو شاعری کے پرانے دواوین کے انتخاب کی اشاعت سے زیادہ انتخاب کرنے والوں پر صرف ہو چکا تھا۔ محکمہ تعلیم خریداری میں گرم جوش نظر نہ آیا۔ ارباب علم کے مشاعرے شعرا سے زیادہ سامعین کو غیر حاضر پا کر غائب ہو گئے۔

"بزمِ ادب پنجاب" کو بھی اب مشاعرہ بازی کی ضرورت نہ رہی۔ پنڈت ہری چند اخترؔ نے پنجاب کونسل کی اسمبلی میں ترجمان کی ملازمت کر لی تاثیر پروفیسری کے ساتھ ساتھ اردو شعر و فن پر نقادی کی داد دینے لگے۔ مجھے دنیائے اردو کے ہر مرکز میں حاضر ہونے کی دعوت ملنے لگی میں حاضر ہوا اور یہ پایا کہ دہلی ہو یا لکھنؤ، علی گڈھ ہو یا حیدرآباد۔ آگرہ ہو یا الہ آباد۔ وہ جو واقعی اہلِ قلب و نظر ہیں کسی کو پنجابی ہونے کی وجہ سے ماخوذ نہیں کرتے۔ میرا دل کدورت سے پاک ہو گیا۔ نظر آیا کہ اردو کی دنیا میں نیازؔ فتح پوری اور رشید صدیقی ایسے آفتاب بھی موجود ہیں۔ بات ع "بیر طول کلام مت کریو" سے بڑھ گئی ہے۔ سخن سے خوگر ہونے کی جھونجھ میں یہ سب کچھ لکھتا چلا گیا۔ اس تحریر کے دوران میں پنڈت ہری چند اخترؔ سدھار گئے ہیں۔ اب دو ہی دن ہوئے۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی سنائی آ گئی ہے۔ مولانا گرامی۔ سر عبدالقادر ظفر اکبر مسعود اور تاثیر پہلے ہی جا چکے ہیں۔ مجھے علم نہیں خود میں اپنے ان بزرگوں اور بچھڑے ہوئے یاروں اور پیاروں سے ملنے کے لئے کب تک اِذن یا اذان کا منتظر رہوں گا۔ میں نے اس دور میں بہت کچھ لکھا لیکن ایک جانب رزق کشائی کے لئے ہاتھ گھسائی تھی۔ دوسری جانب چند ساتھیوں کی ضرورت برائے ہنگامہ آرائی تھی۔ لہٰذا دوسروں کے نام سے لکھا ہوا گاؤ خورد سمجھئے۔ جو میرے پاس ہے حالات و خیالات کی رو سے اصلاح طلب ہے۔ رسائل کے اداریوں کے علاوہ اس دور میں جو لعبورت کتاب شائع ہوا۔ اس میں بچوں کے لئے بہار کے پھول ہندوستان ہمارا (منظوم تاریخِ ہند) اور نثر میں بچوں کے لئے بہت سی کہانیاں۔ ساتھ ہی دو مجلدات میں شاہنامہ اسلام کے تقریباً ۲۵ ہزار اشعار اور نثر میں طبعزاد افسانوں کا ایک مجموعہ ہفت پیکر چند اسلامی نظمیں نیز یہ چھوٹی سی کتاب بھی سوز و ساز جسے اس زمانے میں ایک کارنامہ خیال کیا گیا تھا۔ آج یہ کیا ہے۔ کون جانے ––– شاہنامۂ اسلام کے دو مزید مجلدات اور تلخابۂ شیریں وغیرہ۔ سوز و ساز اور حفیظؔ کے گیت اور نظمیں بلند کی باتیں ہیں۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔ زندگی رہی تو پھر سہی ––––!

للہ اللہ کیا ہوا انجامِ کارِ آرزو
تو بہ توبہ کس قدر ہنگامہ آرائی ہوئی

حفیظ - ۳۱ دسمبر ۱۹۵۶ء

طباعت المستقبل پریس لاہور ۔ باہتمام علاء الدین مظہر نمائندہ خاص مصنف
اشاعت از مجلس اردو ۴۴ - بی ماڈل ٹاؤن - لاہور